مقالات خطیب اعظمؒ

حصہ سوم

مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ

نام کتاب	:	مقالات خطیب اعظمؒ
مصنف	:	مولانا سید غلام عسکری طاب ثراہ
کمپوزنگ	:	شاہد رضا اعظمی، 9696681176
سنہ طباعت	:	
تعداد	:	
قیمت	:	
ناشر	:	

مقالات خطیب اعظم

خونی والدین

قلبی مریض ہونے اور بھاری جسم رکھنے کی ملی جلی جزا اور سزا یہ ہے کہ صبح نماز کے بعد ۳۔۴ کلومیٹر پید چلو۔

مظفر پور شہر میں ایک صبح اسی پروگرام کے مطابق ٹہلنے نکلے۔ نئے شہر میں جاتے وقت نشانات راہ ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتے ہیں تاکہ قیام گاہ پر بخریت واپسی ہو جائے۔ اور میزبان کو مہمان کی تلاش میں پولیس کی مدد لینا نہ پڑے۔ نہ مہمان کو ''ہم کھو گئے'' کی ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

صبح کی یہ چہل قدمی بے ارادہ ہوتی ہے۔ جدھر منھ اٹھا ادھر نکل گئے۔ چونکہ کوئی منزل سامنے نہیں ہوتی ہے بلکہ صرف چلنا مقصد ہوتا ہے۔ اس لیے جاتے وقت مکمل آزادی ہوتی ہے۔ مگر واپسی میں مکمل پابندی کرنا پڑتی ہے۔ جس طرح بچپن سے جوانی تک آدمی جدھر منھ اٹھاتا ہے نکل جاتا ہے۔ لیکن جوانی سے بڑھاپے کی طرف جب واپسی شروع ہوتی ہے تو مکمل پابندی والی زندگی ہوتی ہے۔ بوڑھے والدین، بیوی، بچے، بچوں کی پرورش وتعلیم، ان کی شادیاں، ان کے لیے مکان، ان سب کا حق ادا کرتے کرتے کمر جھکے یا نہ جھکے تمنائیں کمر خمیدہ ہو جاتی ہیں اور بڑھاپے کی سنجیدگی کی سیل زندگی پر لگ جاتی ہے اور جس کا انتظام کرتے کرتے ہم اپنے آخری گھر قبر میں پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ہائے افسوس کہ اس آخری منزل کا انتظام کرنے کی توفیق ہم کو زندگی بھر

نہیں ہوتی ہے۔ اور اس توفیق نہ ملنے کا بھگتان اس وقت تک بھگتنا پڑتا ہے جب تک رحمٰن وغفار کی رحمت ومغفرت کے دامن میں پناہ ملنے کا کوئی سبب نہیں پیدا ہو جاتا۔ اور یہ سبب بھی تب ہی پیدا ہوتا ہے جب دیندار وارث یا پابند شریعت اعزا واحباب مرنے والے کے واجبات ادا کریں۔ حق تلفیاں معاف کرادیں۔ قضائیں اور کفارے ادا کردیں۔ ورنہ پلاؤ کھائیں گے احباب اور فاتحہ ہوگا اور وہ بھی کیسا فاتحہ کی ایک ملک آئے گا تم نے نمازیں نہیں پڑھیں، روزے نہیں رکھے، حج نہیں کیا۔ زکوٰۃ، فطرہ، خمس نہیں نکالا بہن کو حصہ نہیں دیا۔ بیوی کا مہر نہیں ادا کیا لہٰذا برزخ میں تمہاری تکلیفوں کا افتتاح کیا جاتا ہے۔ دوسرا ملک آئے گا تم نے اولاد کو دیندار نہیں بنایا اور اپنا، ان کا اور دین کا نقصان کیا لہٰذا تمہاری تکلیفوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ تیسرا ملک آئے گا تم نے ماتحتوں پر سخت گیری کی۔ محلّہ والوں کو خوفزدہ رکھا۔ دھونس بٹے سے کام چلاتے رہے تو آج تم کو قبر پیس ڈالے گی۔ اور ملک قبر کو مالک زمین کا حکم سناتا ہے اور قبر میت کو فشر کی سزا دیتی ہے۔ زمین پر دسترخوان بچھ رہے ہیں۔ تعزیت میں آنے والے معزز مہمانوں کی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ طرح طرح کی خاطرداریاں ہو رہی ہیں۔ ناز نخرے پورے کیے جا رہے ہیں۔ اور زیر زمیں نامہ عمل کا دسترخوان بچھا ہے۔ اور مرنے والے کے لیے تکلیف اور سخت تکلیف کی ڈشیں ایک ایک کر کے لائی جا رہی ہیں۔ کاش کل ہونے والی بات کو آج ہم دیکھ لیتے اور دنیاوی انتظام کے ہجوم میں بھی آخرت کے انتظام کو پوری اہمیت دیتے۔

جس طرح ہم ہر صبح بے راہ چل پڑتے ہیں۔ اسی طرح آج ہمارا قلم بھی بے راہ چل پڑا۔ اور ٹہلتے ٹہلتے ہم قبر تک پہنچ گئے۔ آیئے اب واپس چلیں۔ حالانکہ یہاں تک

آ کر کوئی واپس نہیں گیا ہے غرضکہ مظفر پور میں ہم ہواخوری کے لیے نکلے۔اگر واقعی ہوا، غذا بن جائے تو آدمی کا جسم تو جسم زندگی بھی ہلکی پھلکی ہو جائے۔مگر پھلکی جسم زندگی کو ہلکا کہاں ہونے دیتی ہے۔رمضان گواہ ہے کہ روزوں نے جتنا ہلکا کیا۔پھلکیوں نے وزن کچھ اور بڑھا دیا۔ اورمعدے کو الگ چوپٹ کردیا پھلکیاں زبان کا چٹخارہ ہیں اور خواہشیں زندگی کا چٹخارہ ہیں۔اور چٹخارہ تباہی وبربادی کا ذریعہ ہے۔چٹخارہ کا مطلب ہے مرچ،اورمرچ، پھر سوسو پھر ناک،تھوک،آنسو پھر پانی پر پانی پھر پیٹ لئے پڑا رہنا اور گھنٹوں کراہنا۔رات بھر میں اگر کچھ نارمل ہوئے تو صبح کو اپنے کیئے پر پھر پچھتائے۔ اب کس سے کہیں اور کیا کہیں کہ کیا تکلیف ہے۔کہاں تکلیف ہے،کیسی تکلیف ہے۔ چٹخارے والی زندگی کے دلدادوں کا یہی حال ہوتا ہے۔فیشن،مشترک تعلیم،ریڈیو،ٹی وی،سنیما اوررنگ برنگ کی مرچیں پہلے تو بڑا مزا دیتی ہیں۔پھر قرض،مفلسی،ضرورتوں کا پورا نہ ہونا،اولاد کی بے راہ روی کے باعث زندگی کی بے کلی ایسی ہوتی ہے کہ ناک کٹ جاتی ہے۔خون تھوکنا پڑتا ہے آنسو پینا پڑتا ہے۔اور ایسی ایسی اندرونی چوٹیں بہو، بیٹی، داماد،اورلڑکیوں کے ہاتھوں لگتی ہیں کہ کیسے بتائیں کیسی تکلیف ہے۔اف کیسی ہوتی ہے وہ تکلیف جو بتائی بھی نہ جاسکے۔خدایا۔ایسی تکلیفوں سے تو اپنی پناہ میں رکھنا۔

معاف کیجئے گا ہم واپسی میں پھر ایک نئی گلی میں گھس گئے۔ جہاں سماج اپنے ہاتھوں اپنے کو نوچے ڈال رہا ہے۔آیئے اس گلی سے جلدی نکل چلیں اور ہاں ہم آپ کو سنا رہے تھے کہ ہم ایک صبح کو ہواخوری کے لیے نکلے۔تو ایک جگہ دیکھا کہ ایک قصائی نے ایک بکرا ذبح کیا ہے اورفرائض قصابی کی تکمیل کررہا ہے۔زمین پر خون تھا۔کھال الگ تھی۔سری الٹی پڑی تھی۔مگر آنکھیں کھلی تھیں۔اور بکرا لٹک رہا ہے۔اوراسی جگہ وہ میمنے

منمنا رہے تھے۔منمناتے میمنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جو ذبح ہوا ہے وہ بھی بچہ ہی تھا۔

لٹکا ہوا میمنہ اور منمناتے ہوئے میمنوں کو دیکھ کر طبیعت بے حد مکدر ہوئی اور اس وقت احساس ہوا کہ شریعت نے کیوں جانور کے سامنے جانور کو ذبح کرنے سے شدت کے ساتھ منع کیا ہے اگر زندہ میمنے نہ ہوتے تو نہ ہم متوجہ ہوتے نہ مکدرر ہوتے۔ قصاب کی سنگ دلی پر ہم دل میں ملامت کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے۔انجانا شہر تھا۔لہٰذا اسی راستے سے قہراً واپس ہونا پڑا۔واپسی پر دیکھا دوسرا بچہ بھی لٹک چکا ہے۔اوراب تیسرے کی باری ہے۔ہم اس تصور سے اس قدر بے چین ہوئے کہ ذہن کو بار بار دوسرے خیالات میں الجھانے کے باوجود دن بھر افسردہ رہے۔

شام کو دیکھا کہ مسلمان،مومن،محبّ اہلبیتؑ میاں بیوی اپنے تین بچوں کو لے کر سنیما جارہے ہیں۔ہم نے آنکھیں بند کرلیں کہ اُف یہ کیسے ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں کو گھیر کر دوزخ کی آگ میں ڈالنے کے لیے لے جارہے ہیں۔وہ تو جانور کے بچے تھے۔ یہ تو انسان کے بچے ہیں۔ وہ قصاب تھا، یہ ماں باپ ہیں مگر ایسے ماں باپ جن کے ہاتھ ان کی اولاد کے خون میں رنگے ہیں۔ہم زیادہ سوچ بھی نہ سکے۔ بلکہ ہم نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔مگر جب یہ دیکھا کہ تینوں بچے آگے آگے اپنے ماں باپ کی ہدایت پر سنیما گھر کی طرف جارہے ہیں تو ہم کو وہ سارے قصاب یاد آگئے جو جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے ہنکاتے ہوئے لے جاتے ہیں۔

آگ ۔ آگ ۔ آگ

یہ کسی انسان کی چیخ نہیں ہے۔ یہ آگ کسی ایک گھر میں نہیں لگی ہے۔ یہ آگ کسی دوکان یا گودام میں نہیں لگی ہے۔ یہ آگ کسی کھلیان میں نہیں لگی ہے۔ یہ آگ کسی ایک گاؤں یا کسی ایک محلّہ میں نہیں لگی ہے۔ بلکہ یہ آگ پورے ملک میں لگی ہے۔ پوری قوم اس میں جل رہی ہے۔ ہر خاندان اس میں جل رہا ہے۔ ہر انسان کے تن بدن میں یہ آگ لگی ہے۔ عورت، مرد، بوڑھے، جوان سب اس آگ میں جل رہے ہیں۔ بچے بھی اس آگ کی لپیٹ میں اپنے بڑوں کے ہاتھوں جل رہے ہیں۔ اس آگ میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو آ رہی ہے۔ اس آگ میں زندگی جھلس گئی ہے۔ اس آگ میں جوانیاں دھواں گئی ہیں۔ اس آگ میں دھڑا دھڑ، شرافت، انسانیت، حیا، ایمان، رشتہ داریاں جل رہی ہیں۔ مگر کچھ لوگ اس آگ سے تاپ رہے ہیں۔ اس آگ سے اپنے گھر میں اجالا کر رہے ہیں۔ اس آگ سے اپنے چولھے پر ہانڈی چڑھا رہے ہیں۔ اس سے چراغاں کا کام لے رہے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے یہ کون سی آگ ہے اور یہ کون جلاد، قصاب، سنگدل، ظالم، ذلیل آدم خور لوگ ہیں۔ تو سنئے اس آگ کا نام ہے شادی، اس کا ایندھن ہیں جہیز، رسمیں، گھراتی، باراتی اور یہ آدم خور جلاد ہیں دولہا اور دولہا کے گھر والے۔ اور وہ تمام خود فریب جو رسموں کے، شگون کے، شکوک کے پجاری ہیں۔ اور یہ تمام افراد بیک وقت بھیڑ بھی ہیں اور بھیڑیے بھی ہیں۔ ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی ہیں۔

رلاتے بھی ہیں اور روتے بھی ہیں۔ ڈستے بھی ہیں اور ڈسے بھی جاتے ہیں۔ نوچتے ہیں اور جو نچے بھی جاتے ہیں۔ سب لہولہان ہیں اپنے ہاتھوں بھی اور غیروں کے ہاتھوں بھی۔ اس سماج کو سب سے پہلے ایک پاگل کتے نے کاٹا تھا۔ اس پاگل کتے کا نام ہے خواہش پروری۔ اس کے اگلے پیروں کے نام ہیں جہیز اور رسمیں اس کے پچھلے پیروں کے نام ہیں قرض مہر اور ساری زندگی لڑکی والوں کا خوفزدہ رہنا اس پر سوار ہیں دولھا میاں۔ اس کے گرد جمع ہیں گھراتی، باراتی اور رسموں کے پجاری اس پاگل کتے کے تیز دانتوں کا نام ہے دکھاوا۔ اس نے اپنے تیز دانتوں سے دین، ایمان، شرافت، رحم دلی سب کو بھنبھوڑ ڈالا ہے۔ پاگل کتا جسے کاٹ لیتا ہے وہ پاگل ہو جاتا ہے اور یہ پاگل جس کو ناخن مار دے وہ بھی پاگل ہو جاتا ہے۔ سب پاگل کتے کی طرح بھونکتے ہیں اور سب کے منھ میں کتے کی شکل کے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔

خواہش پروری کے زیر اثر جو پہلی شادی ہوئی تھی اس جہیز کے نام پر لڑکی والوں کو نچوڑا تھا اور رسموں کے نام پر لڑکے والوں کو نچوڑا تھا۔ پھر سارا سماج پاگل ہو گیا۔ آج ہم آپ اسی پاگل سماج میں جی رہے ہیں۔ جس میں ہر طرف آگ لگی ہے۔ پہلی لڑکی کی پیدائش پر ماں باپ پریشان ہو جاتے ہیں دوسری کی پیدائش پر کانپ جاتے ہیں اور پھر پوری زندگی رعشہ کی یہ بیماری نہیں جاتی۔ لڑکیاں سمجھدار ہو کر محسوس کرتی ہیں وہ جہنم میں ہیں ہر طرف جنسی آگ ہے۔ اس آگ سے بچانے والی پر مسرت شادی کے امکانات جہیز اور رسموں نے بالکل ختم کر دیئے ہیں۔ لڑکی والے روتے ہیں مگر جب اپنا لڑکا بیاہنے نکلتے تو آٹھ آٹھ آنسو رونے والے آٹھ آٹھ ہزار آنسو رلاتے ہیں۔ یہ وہ آگ ہے جو ہم نے لگائی ہے۔ ہم ہی اس کو بجھا سکتے ہیں۔ رسمیں جہالت کا نتیجہ ہیں۔ شگون خدا پر بھروسہ

نہ کرنے بلکہ اس کی طرف سے مشکوک رہنے کا نتیجہ ہے دباؤ ڈال کر جہیز لینا۔ رسموں کی پابندی کا مطالبہ کرنا فعل حرام ہے اور ان کے ذریعہ ملنے والا مال، حرام ہے۔ ہم منگنی سے لے کر رخصتی اور چوتھی چالے تک جو کچھ خرچ کرتے ہیں ان میں سے ۹۹ فیصدی خرچ اسراف اور فضول خرچی ہیں۔ اور فضول خرچی بالکل ناجائز ہے۔ ہماری زبردستیاں ہماری بے مہار خوشیاں، ہماری دین کے احکام سے فراموشیاں ہماری ذہنی تباہی، مالی تباہی، معاشرتی تباہی، معاشی تباہی کا ذریعہ ہیں۔ آج امیر اور غریب سب نقد جہیز اور قرض مہر کی آگ ہیں جل رہے ہیں اور رسموں کے آتشکدہ میں بھن رہے ہیں دکھاوے کی چتا پرستی ہو رہے ہیں۔ آیئے ہم آپ مل کر اس آگ کو بجھائیں۔ شادی کے ہر مرحلہ پر پابند دین رہیں۔ کسی نہ کسی کو کم خرچ سادی، اور پابند دین شادی کی پہل کر کے نکو بننا ہوگا مگر یہی نکو انقلاب آنے کے بعد ہیرو بن جائے گا۔ پہلے یہ شادی پھیکی معلوم ہوگی۔ مگر پھر یہی شادی باعث لذت حیات بن جائے گی اور زندگی کے خالی خاکہ کو رنگ اور نور سے بھر دے گی۔

بہت ہو چکا۔ اب ہم کو ہوش میں آنا چاہیے۔ عقل کے ناخن لینا چاہیے اندھی تقلید کے بجائے برے بھلے کی تمیز پیدا کرنا چاہیے۔ خواہشوں کو قابو میں لانا چاہیے۔ رسموں کو بالکل ختم کر دینا چاہیے۔ لڑکی ہو یا لڑکا۔ اس کے گھر والے ہوں یا پاس پڑوس والے سبکو اس انقلاب لانے میں حصہ لینا چاہیے اور اس لڑائی میں شریک ہونا چاہیے جو رسموں کے خلاف جہیز کے خلاف، شگون، ٹونے، ٹوٹکے کے خلاف، خلاف زندگی کے خلاف شروع ہو چکی ہے۔

شک بری بلا ہے

ہر بلا بری ہوتی ہے پھر وہ بلا کتنی بری ہوگی جس کا نام ہی ''بری بلا'' ہو۔ بری بلاؤں میں شک وہ بلا ہے جو سرفہرست ہے۔ شک کچھ آدمیوں کو زیادہ ہوتا ہے مثلاً جو لوگ آنکھ یا کان سے معذور ہو جاتے ہیں ان کو بات بات پر شک ہوتا ہے۔ بہرا ہر بات کرنے والے کے بارے میں بھی سوچتا ہے کہ یہ میرے بارے میں بات کر رہا تھا۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کو شک ہوتا ہے بیوی کو شوہر کے بارے میں تو شک رہتا ہی ہے۔ شک کے مرکز بہت سے ہوتے ہیں۔ شوہر کسی عورت کے چکر میں تو نہیں ہے ادھر شوہر نے کسی کے ہاتھ کے پکے کھانے کی تعریف کی، کسی کے ہاتھ کے سلے کپڑے کی تعریف کی، کسی کے گھریلو سلیقہ کی تعریف کی، ادھر بیوی کو شک ہوا کہ کہیں شوہر ہاتھ سے بے ہاتھ نہ ہو جائیں۔ دوسرے کے ہاتھوں میں نہ چلے جائیں۔ اس شک کی بنا پر شوہر سے جب بھی موقع نکل آیا بیوی دو دو ہاتھ کرنے لگتی ہیں نتیجہ یہی ہوتا ہے شوہر کسی کے ہاتھ تو نہیں لگتا مگر بیوی کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ جن بیویوں کو یہ شک نہیں ہوتا ان کو خیال نہ کرنے کا شک رہتا ہے۔ دوستوں کا خیال کرتے ہیں۔ اپنے خاندان والوں کا خیال کرتے ہیں۔ ہمارا خیال نہیں کرتے عورت صرف بیوی نہیں ہوتی ماں، بہن وغیرہ بھی ہوتی ہے شک کا مرض ان کو بھی ہوتا ہے۔

جب سے شادی ہوگئی ہے اس کو ہمارا خیال نہیں رہتا۔ بھیا کو تو بس بھابھی ہی کا

خیال رہتا ہے اب ہم بہن ہی نہیں رہ گئے ۔کوئی نہیں سوچتا کہ جب سب سے رشتہ ہے تو خیال سب کا رکھنا ہوگا۔لہٰذا خیال تقسیم ہوگا پہلے کے بہ نسبت خیال کرنے کی مقدار کم ہوتی جائے گی جب صرف ماں تھی تو خیال کا مرکز واحد تھا۔ جب بیوی آ گئی تو خیال کی تقسیم ضروری ہے ماں کو حصہ رسدی پر راضی ہوجانا چاہئے اور بیوی کو کل حصہ ہڑپ کرنے کی کوشش کر کے اپنے کو اپنے ماحول کو بدمزہ نہیں بنانا چاہئے ۔ بلکہ اپنے حصہ پر قناعت کرنا چاہئے ۔اولاد ہوجانے کے بعد خیال کرنے کی مقدار میں مزید کمی مزید تقسیم کے باعث پیدا ہوگی ۔ بہن ۔ بھائی کو بھی حالات کے پیش نظر بدلتی صورت حال پر قانع اور راضی رہنے کی عادت ڈالنا چاہئے تا کہ سب خوش رہیں ۔

شوہر کا بھی فرض ہے کہ صرف بیوی کا نہ ہوجائے بلکہ سب کا حسب حیثیت وحسب ضرورت خیال رکھے ۔ یہ بھی نہ ہو کہ ماں باپ ، بہن بھائی ،اعزا،اقرباء کے خیال کا بھوت اس طرح سوار ہوجائے کہ بیوی کی ضرورتیں اوراس کی سن وسال کے مطابق پیدا ہونے والی امنگیں پائمال ہوجائیں بس مختصر یہ ہے کہ مختلف رشتوں میں جڑی زندگی میں سب کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے ۔ سب کو اس کا حق ملنا چاہئے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب سب یہ یاد رکھیں کہ ہمارے ساتھ اور نازک دل بھی ہیں صرف ہمارا ہی دل نازک نہیں ہے ۔زندگی کا ہر قدم احتیاط سے رکھنا چاہئے ۔جیسے ننگے پیر چلنے والوں کے درمیان جوتا پہن کر چلنے والے کا فرض ہے کہ ہر قدم رکھنے کے پہلے دیکھ لے کہ کسی کا پیر تو نہیں دب رہا ہے ۔جس طرح اس زمین پر سے گذرنے والے کے ہر قدم کا محتاط ہونا ضروری ہے جس طرح زمین پر چیٹیاں پھیلی ہوئی ہوں اسی طرح گھر ، خاندان ، احباب کے درمیان پھیلی زندگی میں بغیر احتیاط چلنے میں حق تلفیاں اس طرح ہوجاتی ہیں کہ حق تلفی

کرنے والے کو اپنی خطا کا احساس بھی نہیں ہوتا خوشگوار زندگی کے لیے ضروری ہے کہ شک کو داخل نہ ہونے دیا جائے شک کا حملہ کسی پر بھی ہوسکتا ہے ۔اکثر بوڑھوں کو شک رہتا ہے کہ اب ہم نہیں کماتے تو ہمارا خیال کسی کو نہیں شوہروں کو شک رہتا ہے کہ اولادوں کے بڑے ہوجانے کے بعد اب بیوی کو ہماری فکر نہیں رہتی ۔ نئے دوستوں کو دیکھ کر پرانے دوست محبت کی فرضی کمی کے شاکی ہوجاتے ۔احساس کمتری کا مبتلا تو بس شک ہی شک میں زندگی بسر کرتا ہے اسے بندوں کے علاوہ خدا کے بارے میں بھی شک ہوجاتا ہے کہ اسے ہمارا خیال نہیں ہے غرض کہ شک شیطان کا وہ بہترین ، آزمودہ ، کارآمد حربہ ہے جس کے ذریعہ اس نے لوگوں کے ایمان چھین لئے ۔ رشتے تڑوادیئے ۔محبتیں ختم کرادیں ۔لڑائیں لڑوادیں ۔ گھروں کو دوزخ بنادیا ۔خاندانوں کو جھلسا دیا ۔ زندگیوں کو مرجھادیا ۔خوشیوں کو لوٹ لیا غموں کی زہریلی برسات کرادی ۔انسانوں کو زندہ درگور کردیا لہٰذا اس پر بری بلا سے بچئے اور دوسروں کو بچنے میں مدد دیجئے ۔ دونوں کام عظیم عبادت ہیں ۔ دنیاوی زندگی خوشحالی کے باعث حسینیت کا نمونہ بن جاتی ہے اور حسن ظن مرنے کے بعد جنت کے مزے دلوادیتا ہے ۔

سوچیے
پھر قدم اٹھایئے

قدیم وجدید، بڑھاپے اور جوانی کے نظریاتی نام۔ گھروں میں، انجمنوں میں، اداروں میں، پارٹیوں میں، جماعتوں میں، حکومتوں میں بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان جنگ لڑی جارہی ہے۔ جوانوں کی حمایت کے لیے نئے خون کی ضرورت کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ بوڑھوں کی حمایت میں دلیل دی جاتی ہے کہ صرف جذبہ کافی نہیں ہے تجربہ بھی ضروری ہے۔ لیکن بوڑھے ہوں یا جوان دونوں ہوس کا شکار ہیں اور دونوں ہوس کے شکاری بھی ہیں۔ ہوس اس چیز کا نام جس میں بس نہ ہو۔ اگر بس یعنی انتہا آجائے تو پھر ہوس باقی نہیں رہتی۔ ہوس اس چیز کی بھی ہوتی ہے جو اپنے بس میں نہ ہو۔ ہوس کا مطلب ہے بس ہر چیز چاہیے۔ جائز ہو یا ناجائز۔ ہوس کے مہذب شکاری سیاست داں، حکمراں، لیڈر، نیتا، بیوپاری، بدنام کنندہ دین ملا۔ انسانی زندگی سے کھیلنے والے ڈاکٹر پیسہ لے کر بھی تعلیم نہ دینے والے اساتذہ ہوتے ہیں۔ غیر مہذب ہوس کے شکاری غنڈے، بدمعاش، لفنگے، چور، اچکے، فریب کار، ڈاکو، قاتل کہلاتے ہیں ہوس کی اس ہمہ گیری کو ایک لطیفہ میں بیان کیا گیا ہے کہ بوڑھے جوان، باپ بیٹے سب اسی زلف کے اسیر ہیں۔

لطیفہ یہ ہے کہ باپ بیٹے کھانا کھانے بیٹھے کھانا اتنا کم تھا کہ ایک کا بھی پیٹ نہ بھرتا بیٹے نے باپ سے کہا تم نہ کھاؤ مجھے کھانے دو تم تو بہت کھا چکے ہو ہم کو ابھی کھانے کا موقع کم ملا ہے۔ باپ نے کہا بیٹا خدا تم کو زندہ رکھے ابھی جوان ہو بہت دن کھاؤ گے میں قبر میں پیر لٹکائے ہوں۔ بس جو دن ہیں ان میں کھانے دو۔

بوڑھوں اور جوانوں کی لڑائی صدیوں سے جاری ہے اور جاری رہے گی۔ یہی لڑائی جب نظریات، اصول، سوسائٹی، فیشن، رسم رواج، رہن سہن، چال چلن میں لڑی جاتی ہے، تو بوڑھے نظریات واصول وغیرہ کو قدیم کا نام دیا جاتا ہے اور جوان رسم ورواج اور نئے چال چلن کو جدید کا نام دیا جاتا ہے۔ ہڈی پر مر مٹنے والے آنکھ بند کر کے ہر قدیم چیز کی حمایت کرتے ہیں۔ آزادی کے بدمست ہر نئی چیز کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ ان بحثوں کو علمی کہا جاتا ہے تحقیق اور ریسرچ کے نام سے نوازا جاتا ہے۔ زمانہ کو روشن کہا جاتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آنکھوں والوں نے آنکھ پر پٹی باندھ کر سفر شروع کیا ہے۔ ٹھوکر کھانے کا نام تجربہ رکھتے ہیں اپنے کو اپنے ہی سے چوٹ پہنچانے کا نام آزادی خیال رکھتے ہیں ہر بے سبب کام کا نام فیشن قرار دیتے ہیں۔ بینائی پر نابینائی مسلط ہے۔ لہٰذا قدامت کے حامی کسی ترمیم پر راضی نہیں ہیں اور جدیدیت کے پرستار زندگی میں کہیں قرار لینے پر تیار نہیں ہیں۔

لیکن سیلاب میں بہہ جانا دانشمندی نہیں اور تلاطم سے گھبرا کر کشتی سے اتر کر ریت پر بیٹھ جانے سے منزل نہیں ملے گی۔ بلکہ مضبوط کشتی میں بیٹھ کر موجوں سے لڑنے کا حوصلہ لے کر سفر شروع کرنا چاہیے۔ اگر ناخدا کو خدا کا سہارا ہے تو انشاء اللہ منزل ملے گی۔ اگر ڈوبیں گے بھی تو کم از کم بعد میں آنے والوں کے لیے نشانِ منزل بن جائیں

گے لہٰذا قدیم وجدید کی لڑائی میں آنکھیں کھلی رکھئے۔ دماغ پرسکون رکھئے۔ دل کو بے قرار نہ ہونے دیجئے۔ ہر معقول بات مان لیجئے چاہے وہ قدیم ہو چاہے جدید ہو اور معقولیت کا معیار دین کو قرار دیجئے۔ اللہ، رسول، معصومین علیہم السلام کے ارشادات سے روشنی حاصل کیجئے۔ ان سارے قدیم رسم ورواج کو ترک کرنے کی مہم چلایئے جن کی نہ کوئی مذہبی بنیاد ہے اور نہ عقلی بنیاد ہے بلکہ وہ صرف ’’ہوتا آیا ہے‘‘ کی بیساکھی کے سہارے چل رہے ہیں۔

ایسے قدیم رسم ورواج کو چھوڑنے سے شادی، غمی کے تقریبات آسان اور کم خرچ ہو جائیں گے اور بہت سی گھٹی زندگیوں کو سانس لینے کا موقع مل جائے گا ورنہ مرحوم کے بعد تقریباتِ غم وارثوں کو زندہ درگور کر دیتی ہیں۔ اور شادی کے بعد دونوں گھرانے مقروض ہو کر عرصہ تک غمگین زندگی بسر کرتے ہیں۔ رواسم نے مذہب کو بھی بوجھل بنا دیا ہے اور واجبات سے غافل بنا دیا ہے۔

اسی طرح نئے زمانہ کے فیشن، تہذیب اور رواجوں پر بھی کڑی نظر ڈالئے بچے کے لیے اچھی تعلیم ضروری ہے مگر مہنگا اسکول ضروری نہیں ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم ضروری ہے لیکن اس تعلیم کا مقصد سروس ہرگز نہ ہونا چاہئے۔

تعلیم ضروری ہے مگر حیا، عفت اور نسائی روحانیات کو قربان کر کے تعلیم ہرگز حاصل کر نہ کی جائے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی فکر ہے تو خالص لڑکیوں کے مدرسہ قائم کیجئے۔ اپنے انتظام میں قائم کیجئے۔ اپنا ماحول رکھئے اگر سب جگہ ممکن نہیں ہے تو جہاں جہاں ممکن ہے وہاں وہاں اسلامی گرلس اسکول اور کالج دوسرے مسلمانوں کے تعاون سے قائم کیجئے۔

بہت سے برادران وطن بھی لڑکیوں کی موجودہ تعلیم کے برے اثرات سے سخت بے چین ہیں ان سے روابطہ پیدا کر کے تعاون حاصل کر سکتے ہیں اپنا راستہ نہ چھوڑے دوسرے کو اپنے راستہ پر لانے کی ہمت کے ساتھ کوشش کیجئے۔ خدا کے سہارے کام کیجئے کامیابیاں آپ کے قدم چومیں گی۔

بے دینی کے دنیاوی نقصان

رسم اور رواج کی طرح اکثر خیالات ونظریات بھی صدیوں جامد صورت میں باقی رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح شادی، غمی، رہن سہن، میل جول وغیرہ میں رسمیں رائج ہوجاتی ہیں اور رواج جاری رہتے ہیں۔ اسی طرح علمی اور فکری دنیا میں بھی رواجی نظریات اور رسمی فکریات کا چلن پایا جاتا ہے۔ جس طرح رسموں کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا ہے کہ یہ کیوں ہوتی ہیں۔

اسی طرح رسمی اور رواجی افکار ونظریات کے بارے میں بھی کوئی سوچنے کی زحمت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ خیالات نسلوں میں علم سینہ بن کر اس طرح منتقل ہوتے رہتے ہیں کہ ان کے خلاف سوچنے کی صلاحیت ماحول میں باقی نہیں رہتی۔

ان ہی رسمی اور رواجی خیالات میں سے ایک یہ خیال بھی ہے کہ دین چھوڑ دینے سے جو کچھ نقصان ہوگا وہ صرف آخرت کا نقصان ہوگا۔ دین چھوڑنے سے دنیاوی نقصان کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ دین ماننے میں ضرور دنیاوی نقصان ہوتے ہی۔ میں ان خیالات کو رسمی اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ ہمارے سماج میں اس طرح رائج ہیں اور دماغوں میں اس طرح رچ اور بس گئے ہیں کہ جب میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہماری بے دینی سے ہماری دنیا تباہ ہورہی ہے تو وہ مجھے اس مشکوک نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے ذہنی مریض کو دیکھا جاتا ہے۔ میں بھی ان کی نظر کے پیش نظر ان کو قابل رحم نظر سے دیکھ رہا

تا۔ اور وہ یقیناً قابل رحم تھے۔ کیونکہ کوئی بھوکا، ننگا، بیمار، یتیم، بیوہ صرف اس لئے قابل رحم ہوتے ہیں کہ وہ غذا، لباس، صورت، باپ، شوہر سے محروم ہیں۔ لہٰذا جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی خیالات سے محروم ہو۔ وہ یقیناً قابل رحم ہے بلکہ زیادہ قابل رحم ہے۔ کیونکہ جو لوگ غیروں کے ہاتھوں یا حوادث کے ہاتھوں قابل رحم ہوجاتے ہیں۔ ان سے بدتر حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ کر لیتے ہیں۔ اصل سرمایہ خیالات ہیں جو جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اور عمل کے ذریعہ وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو مل سکتا ہے حکیم اسلام مولائے کائنات امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اسی لیے اصل یتیم اس کو قرار دیا ہے۔ جو عقل وعلم نہ رکھتا ہو۔ عرب کی مفلس قوم سارے زمانہ پر صرف اس لئے چھا گئی کہ اس کے پاس ہر طرح کا افلاس تھا۔ مگر خیالات کا افلاس نہ تھا۔ اسلام نے اس کو خیالات کے ایسے خزانہ عطا کردیتے تھے کہ نسلیں ختم ہوگئیں۔ صدیاں گذر گئیں۔ نظریات کے ملبوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جن نظریات کا کبھی سکہ چلتا تھا۔ آج وہ کتاب وتاریخ کے میوزیم میں رکھ دیئے گئے ہیں لیکن جس طرح اب اسلام کی ہر دن ایک نئی شان ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام بھی نہ کبھی پرانا ہوا۔ نہ کبھی اس میں کہنگی اور فرسودگی پیدا ہوئی۔ بلکہ ہر نئے دن کے مطابق وہ نئے افکار وخیالات انسانوں کو عطا کرتا رہتا ہے۔ بیدار ذہن ان خیالات سے نئی امنگ، نیا جوش حاصل کرتے ہیں اور نئی زندگی کو جنم دیتے ہیں لیکن جن دماغوں پر ڈھکن بند ہیں۔ ان ایرٹائٹ دماغوں میں اسلامی خیالات کو جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ اسلامی خیالات سے محرومی ہی وہ مفلسی ہے جس نے دنیا کے امیر ترین عرب ملکوں کو دوکوڑی کا بنا رکھا ہے۔ اور اسلامی خیالات ہی کا یہ فیض ہے کہ آج ایران کی طرف ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ نظر نظر میں ضرور فرق ہے۔

کوئی محبت سے دیکھ رہا ہے۔ کوئی نفرت سے، کوئی خوفزدہ ہوکر کوئی پر امید ہوکر کسی کی نگاہ میں خیرگی ہے تو کسی کی نظر میں حیرت۔ کوئی روشنی طلب نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ کسی کی نظر میں تجسس ہے۔

ترقی یافتہ مغرب حیران ہے کہ ایران کس سے مشورہ کرتا ہے۔ سی آئی اے نے یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ خمینی استخارہ دیکھنے میں، خدا سے رائے لیتے ہیں۔ آج کل ''استخارہ'' پر ریسرچ ہو رہی ہے۔ یہ ریسرچ جہاں بھی ختم ہو۔ بہر حال خدا کا یقین ہی وہ سورج ہے جس سے اسلامی خیالات کی شعاعیں نکلتی ہیں، اور ان میں شعاعوں سے انفرادی، اجتماعی اسلامی زندگی پیدا ہوتی ہے۔

غرضکہ کل کا مفلس عرب اسلامی خیالات سے مالا مال تھا۔ لہٰذا دنیا پر چھا گیا اور وہ ایران و روم جو دنیا پر چھائے ہوئے تھے مٹ گئے کیونکہ وہ افکار کے مفلس تھے۔ آج کا عرب پھر مفلس افکار اسلامی ہے۔ لہٰذا روز بروز مٹتا جا رہا ہے۔ اور آج کا ایران اسلامی افکار سے مالا مال ہے لہٰذا دنیا پر چھا رہا ہے اور دماغوں پر اس کی چھاپ پڑتی اور بڑھتی جا رہی ہے۔ بے دینی سے ہماری دنیا تباہ ہو رہی ہے یا نہیں۔ اس مضمون میں اس بات کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ چند نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جب دو مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کی نزاع پیدا ہو تو شرعاً ان پر عدالت میں جانا حرام ہے۔ بلکہ حاکم شرع (یعنی عادل فقیہ) سے فیصلہ کرانا لازم ہے۔ اگر ہمارا سماج اس دینی پابندی کو اپنا لے تو مقدمہ بازی کی مہلک تباہیوں سے ہماری دنیاوی زندگی محفوظ ہو جائے۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے کے اصول پر جب سماج کو فقیہ کی ضرورت ہوگی تو دینی تعلیم میں بھی اضافہ ہوگا اور

مضبوط کردار والے علماء بھی زیادہ پیدا ہوں گے۔

۲۔ کسی مسلمان مرد یا عورت پر زبان سے یا اشارے یا کنایہ وغیرہ سے فطری یا غیر فطری بدکاری کا الزام لگائے مثلاً حرام زادہ کہہ دے تو ایسے شخص کو اسّی کوڑے کی سزا ملنا چاہئے۔ اگر چہ ہمارے پاس کوڑے لگانے کی طاقت نہیں ہے لیکن سماج میں یہ احساس بیدار ہو جائے کہ یہ الزام بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ دوزخ کی سزا کے علاوہ دنیا میں بھی یہ سزا دی جاتی ہے۔ تو زبانیں رک جائیں گے۔ زبانوں کے رکنے سے بدگمانی، اختلافات کا ایک آتش فشاں ٹھنڈا ہو جائے گا۔

۳۔ جو شوہر اپنی بیوی کی کفالت نہ کرے۔ حاکم شرع کے ذریعہ اس کی مشکل کا حل کفالت شوہر یا طلاق کی صورت میں فوراً نکل سکتا ہے اور زندگیوں کو سلگنے سے بچا سکتا ہے۔

۴۔ جہیز کی مالک لڑکی ہے۔ داماد کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ دباؤ ڈال کر جہیز وصول کرنا یا مہر رکھوانا حرام ہے۔ نہ صرف فعل حرام ہے بلکہ مال حرام ہوگا۔ بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جاسکتی۔ شوہر مہر ادا کرنے سے قبل بیوی کی رضامندی کے بغیر بیوی پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتا۔ اگر ان مسائل کی پابندی شروع ہو جائے تو شادیوں کے پٹاخوں سے جو نسلیں بھک سے اڑ جاتی ہیں اور عمریں جھلس جاتی ہیں اس آگ سے نجات مل جائے۔

۵۔ اگر لوگ اپنے واجبات زکوٰۃ، فطرہ، خمس نکالیں، اپنے مرحومین کے ذمہ باقی رہنے والے قضا نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ خمس ادا کریں تو کسی غریب کو مدد

مانگنا پڑے اور اجرت پر نماز، روزہ کے ذریعہ شریف اور مجبور عورتوں اور مردوں کے لیے ایک بہترین ذریعہ معاش پیدا ہوجائے۔

ایسے بے شمار نمونہ پیش کئے جاسکتے ہیں جنکے ذریعہ بے دینی کے دنیاوی نقصانات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔لیکن آخر میں ایک اہم ترین دنیاوی نقصان کی طرف متوجہ کرکے بات ختم کی جاتی ہے۔اگر ہم پابند دین مسلمان ہوجائیں تو تجارت، صنعت، زراعت، اجرت، ملازمت ہر شعبہ حیات میں مسلمان قابل اعتماد قرار پاجائے گا۔اور کردار کا یہ وزن جہاں ہماری عددی قلت کا نعم البدل ہوجائے گا وہاں اس گرتے ہوئے ملک کے لیے ایک مضبوط سہارا بن جائے گا۔ابھی وہ لوگ زندہ ہیں جنہوں نے سنا ہے کہ ''مسلمان ہوکر جھوٹ بولتے ہو'' ڈاڑھی رکھ کر بے ایمانی کرتے ہو، وغیرہ وغیرہ۔

یعنی پابند دین مسلمانوں نے اپنوں اور غیروں میں ایک ایسا وقار پیدا کرلیا تھا جو ہم کو دوسروں سے ممتاز اور بے نیاز بناتا تھا اور دوسروں کو ہماری نیازمندی پر بخلوص آمادہ کرتا تھا۔اس وقار کے کھودینے سے ہم اس طرح کھو گئے ہیں کہ ہمارا انفرادی اور قومی وجود ختم ہوچکا ہے۔پھر کیوں نہ ہم پابند دین بن کر اپنے کو آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی محاذ زندگی پر نقصان سے محفوظ رکھیں۔

ہم نہ دبتے ہیں نہ دباتے ہیں

اسلام فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کو صحیح رخ پر لگانے آیا ہے۔لہٰذا اس نے اعلان کیا کہ ''دین میں دباؤ کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' لیکن لوگوں نے اسلام کے اس قرآنی اعلان کا مفہوم نامکمل سمجھا ہے۔ہر شخص یہی کہتا سنائی دیتا ہے کہ اسلام اپنے کو طاقت کے ذریعہ نہیں بلکہ ہدایت کے ذریعہ منواتا ہے۔یہ بات بالکل سو فیصدی درست مگر یہ مسئلہ کا صرف ایک رخ ہے۔اور ادھوری بات ہے۔مکمل بات اور مسئلہ کے دونوں رخ یہ ہیں کہ دین میں دباؤ ناجائز ہے یعنی نہ دوسرے پر دباؤ ڈالنا جائز ہے اور نہ کسی کے دباؤ کو قبول کرنا جائز ہے۔اسلام کا نعرہ ہے کہ ''ہم نہ دباتے ہیں اور نہ دبتے ہیں۔''

چونکہ انسان کو اس کے اعمال وافعال میں صاحب اختیار بنا کر خدا نے پیدا کیا ہے تاکہ جو نیک ہے۔ایمان لائے، عمل صالح انجام دے، معاشرہ کو نیک بنانے کی کوشش کرے اور ان تمام کوششوں کی جزا میں جنت پائے وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے نیک بنے مجبوراً نیک نہ بنے۔اسی طرح جو بد بنے، ایمان نہ لائے۔دین کی پابندی نہ کرے۔معاشرہ کو گمراہ کرے اور اپنے کرتوتوں کے عوض دوزخ جائے وہ بھی اپنے بااختیار عمل کے باعث بد اور برا قرار پائے۔بدی کرنے پر مجبور نہ ہو۔

انسان کا اپنے اعمال وافعال اور کاموں میں مجبور ہونا بلکہ صاحب اختیار ہونا ہی وہ بنیاد ہے جس پر مذہب قائم ہے۔اگر عمل انسانی کا اختیار ختم ہوجائے تو تصور مذہب

بھی ختم ہو جائے گا۔

کسی قیمت قبول نہیں کرنا ہے۔اسے رد کر دینا ہے۔اسے واپس کر دینا ہے۔
اس کے خلاف جدوجہد کو جاری رکھنا ہے۔غیر کے دباؤ کی مکمل مدافعت کی تین صورتیں
ہیں۔(۱) جہاد۔(۲) صلح۔(۳) تقیہ۔

دین کی نظر میں جتنا بڑا جرم ہے دباؤ ڈالنا۔اس سے بڑا جرم ہے دباؤ قبول
کرنا۔حضورؐ کی مکی زندگی تفسیر ہے دباؤ نہ ڈالنے کی اور مدنی زندگی کے دس سال میں
۸۲ر بار دشمن کی لشکر کشی کا مسلح مقابلہ اور غزوات وسرایا کا جہاد تشریح ہے دباؤ قبول نہ
کرنے کی۔

بانی اسلام کے بعد محافظ اسلام علیؑ کی ۲۵ر سالہ خاموشی نبیؐ کی مکی زندگی کی
پیروی ہے۔اور ۵ سالہ عہد حکومت میں جمل وصفین ونہروان کی جنگیں لڑنا اور لڑائی کی
تیار کے دوران آپ کا شہید ہو جانا رسول اسلام کی مدنی زندگی کی پیروی ہے۔

باپ کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام کا چھ ماہ کا زمانۂ جنگ، نانا اور بابا
کی زندگی کے پہلے رخ کی توضیح ہے۔اور اسلام کے بے نشان ہونے کو قبول کرنے کے
بجائے صلح کو قبول کرنا اب وجد کی ہادیانہ زندگی کے دوسرے رخ کی وضاحت ہے۔

اسی طرح بھائی کی صلح میں شرکت کرنا اور دس سالہ عہد امام حسنؑ میں اور امام
حسینؑ کا شریک صلح رہنا اور شہادت امام دوئم کے بعد حضرت سید الشہداء کا اپنے عہد میں
ذمہ دار صلح رہنا اور جب شرائط اگر ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے تو ہدایت کس بات کی کی جائے
گی۔نبی، رسول، امام کس مقصد کے لیے آئیں گے۔دین و مذہب مجبور سے کیا کہے گا۔
جس کو اپنے قدموں چلنے کا حق ہی نہیں۔اس کے لیے شریعت کیوں احکام لائے گی۔

جس طرح پتھروں، درختوں، چاند، سورج، آگ، پانی، زمین وغیرہ کے
لیے نہ مذہب آیا نہ دین آیا۔نہ ہادی آئے نہ شریعت آئی۔کیونکہ یہ سب اپنے کاموں
مجبور ہیں صاحب ارادہ اور مختار نہیں ہیں۔اسی طرح اگر انسان بھی مجبور رکھا گیا ہوتا تو
مذمت و مدح، تنقید و تعریف، ہدایت و گمراہی وغیرہ میں سے کسی بات کا تعلق انسان
سے نہ ہوتا۔جبکہ مذہب کا نہ ماننے والا اور دین کا انکار کرنے والا بھی انسان کو مدح
و مذمت، تنقید و تعریف کے قابل سمجھتا ہے اور ہدایت یافتہ یا گمراہ قرار دیتا ہے۔
غرضکہ انسانی شرف اور دین و مذہب کی ضرورت، نبیوں اور اماموں کی رہبری اور
قیادت، علم و دانش کی ساری افادیت کا دارومدار انسان کا اپنے عمل میں مجبور نہ ہونا
بلکہ صاحب اختیار ہونا ہے۔

انسانی عمل کے بااختیار ہونے کی حقیقت کو سمجھ لینے والا۔اس بات کو بخوبی
سمجھ لے گا، اگر دباؤ ڈال کر کسی مجبور سے دین منوالیا گیا تو اس ماننے کو دین نہیں
کہا جا سکتا یہ تو دین کے نام پر انسانی اختیار کا مذاق اڑانا ہوگا اور انسان کو اپنے اختیار
کے ساتھ نیک دیکھنے کی تمنا رکھنے والے دین کے ساتھ بھی مذاق کرنا ہوگا۔فطری ذوق
کو اجاگر کر کے ایسے شوق کی صورت دینے والا کردار ساز دین اسلام دباؤ ڈال کر دین
منوانے کو کسی طرح جائز نہیں مانتا۔غیروں پر دباؤ ڈالنے کی اجازت نہ دینے والا دین
اپنے ماننے والوں کو اس بات کا بھی پابند کرتا ہے کہ تم غیروں کا دباؤ بھی کسی قیمت پر
قبول نہ کرو۔اگر غیر دباؤ ڈالتے ہیں تو بہر حال اس کا مقابلہ کرنا تم پر واجب ہے۔اگر
مسلح مقابلہ کا موقع ہے تو جہاد کرو۔اگر پر امن مقابلہ کا موقع ہے تو صلح کرو تاکہ تمہاری
دینی و ملی و جماعتی حیثیت برقرار و محفوظ رہے۔اگر پر امن حالات بھی نہیں ہیں اور مسلح

مقابلہ بھی ممکن نہیں ہے تو حالات کو اپنے اوپر سے گذر جانے کا موقع اس طرح دو کہ تم اپنی جگہ پر قائم ودائم رہو۔ مقابلہ ومدافعت کے بجائے خاموشی یا لفظی حکمت عملی کے ذریعہ حالات کو گذر جانے دو۔ جس طرح جب سیلاب آتا ہے تو لچک نہ پیدا کرنے والے تناور درخت اکھڑ جاتے ہیں تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں۔ مگر لچک قبول کرنے والے نرم ونازک درخت اپنی جڑوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ اپنے اصول کو قربان نہیں کرتے۔ البتہ ان کی شاخیں سیلاب کے رخ پر ہو جاتی ہیں۔ سیلاب گذر جاتا ہے۔ طوفان تھم جاتا ہے۔ چڑھتا پانی اتر جاتا ہے حالات معمول پر آجاتے ہیں اور معمولی درخت غیر معمولی درخت غیر معمولی حالات کا اپنی لچک کے ذریعہ مقابلہ کرنے کے بعد اپنی جگہ پر یوں قائم دکھائی دیتا ہے کہ اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ شاخیں سرسبز ہوتی ہیں انسانی زندگی کی اس دفاعی لچک کا دینی نام تقیہ ہے۔ جسے اکھڑ اور ضدی سمجھ والے بزدلی وغیرہ کے لفظوں سے نوازتے ہیں۔ لیکن علم وحکمت والی عقل اسے دانش کہتی ہے اور اسلام کو ''قلب مطمئن'' کا نام دیتا ہے۔ اور قابل تعریف مردانگی قرار دیتا ہے۔

ایک بار اس حقیقت کو پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ غیر کے دباؤ کو بہرحال صلح کی آخری خلاف ورزی یزید کی شکل میں نمودار ہوئی اور جب دباؤ ڈالنے کی ظالمانہ تحریک اپنے نقطۂ عروج پر مطالبۂ بیعت کی شکل میں نمودار ہوئی تو آپ کا جہاد کربلا اپنے آبائی ہادیانہ کردار کے دونوں خون کو بہ ترتیب وبہ تدریج پیش کرتا ہے۔

امام چہارم سے لے کر گیارہویں امام تک کی شہادت ان کی قید خانہ میں اور خانہ قید ونظر بندگی کی زندگی اور ہادی آخر کی غیبت اور بعد ظہور زمین کو ظلم سے پاک کردینا

اور سوائے اسلام کے سب کو نیست ونابود کردینا دو الگ الگ کردار نہیں ہیں بلکہ نہ دباؤ ڈالتے ہیں نہ دباؤ مانتے ہیں کے اصول پر عمل مسلسل ہے۔

دنیا میں خدا کی خاموشی اور آخرت میں مجرموں کی سزایابی ومحسنوں کی عزت افزائی بھی اسی اصول کے دونوں رخوں پر عمل درآمد ہے۔

از خدا تا امام۔ از ابتدا تا انتہا جب ہم نے اس اصول کے علمی وعملی دونوں رخوں کی تصویریں دیکھ لی ہیں اور سمجھ لی ہیں تو ہمارا فریضہ ہے کہ دین کی تعلیم کو عام کریں تاکہ افراد قوم سماج کے دباؤ سے نہیں بلکہ سمجھ کر اسلام وایمان حاصل کریں اور دین کی تبلیغ کو عام کریں تاکہ دوسرے رغبت کی بنا پر اسلام کی طرف راغب ہوں۔ نیز خود پابند دین بنیں اور پابند دین معاشرہ پیدا کرنے میں منہمک رہیں تاکہ ہم اور ہمارا معاشرہ اندرونی خواہشات کے دباؤ سے بھی اور غیروں کی دنیاوی چمک دمک اور سیاسی وسماجی دباؤ سے بھی محفوظ رہیں اگر ان میں سے کسی ایک کام سے بھی ہم منحرف ہوتے ہیں تو محشر میں مجرم قرار پائیں گے۔ آج جب دینی قیادت ''ولایت فقیہ اور تقلید اعلم'' کے خلاف ہوا وہوس کی پرستار اور انتشاد پسند طاقتیں صف بستہ ہو رہی ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم اپنے ائمہ معصومین علیہم السلام کی ہدایت پر گامزن رہیں اور دین کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں بھی کسی غیر اسلامی دباؤ کو قبول نہ کریں اور دباؤ قبول کرنے والے سماج کو پیدا کرنے کے دینی تعلیم ودینی پابندی کی مہم میں لگ جائیں اور اس مہم کو محبت اہل بیت علیہم السلام کے کوثری چشمہ سے سیر وسیراب کریں تاکہ بنجر انسانیت گلزار دین بن جائے۔

اٹھئے کہ باغبان چمنستان دین کا وقت ظہور دن بدن قریب ہوتا جارہا ہے۔

ورنہ آج پریشانی اور کل پشیمانی ہمارا مقدر بن جائے گی۔اور روزانہ اپنا حساب کیجئے کہ ہم کسی غیر اسلامی خواہش یا تمنا کا دباؤ تو نہیں قبول کرر ہے ہیں نیز اس کی بھی مشق کیجئے کہ اگر آپ کے سامنے کسی مومن کی جان مال، عزت آبرو اور ایمان کو نشانہ تنقید بنایا جار ہا ہے۔ چاہے یہ ظلم کرنے والا دنیاوی وجاہت کا کتنا ہی مالک کیں نہ ہو مگر اس کے سامنے اپنے ایمانی بھائی کی مدد کرتے ہوئے تنقیدی ظلم کے خلاف لفظی وعملی احتجاج کیجئے۔ ظالم کے سامنے چپ بیٹھا رہنا بھی بڑا گناہ ہے۔

قیاس

علم کی ضد کا نام جہالت ہے۔علم دلیل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جہالت کے ایک ذریعہ کا نام قیاس ہے۔خداوند عالم نے جب زمین پر خلیفہ کے بنانے کا اعلان کیا تو چونکہ جناب آدمؑ سے پہلے زمین پر جنوں کی آبادی تھی انہوں نے فساد کیا تھا۔ خونریزی کی تھی لہٰذا پچھلی اجاڑی جانے والی قوم کی جگہ پر جو نئی قوم آباد ہونے والی تھی جن میں ایک اللہ کا خلیفہ مقرر کیا جانے والا تھا اس نئی آباد ہونے والی قوم کے بارے میں ملائکہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو پھر ایسے لوگوں کو آباد کرے گا جو پچھلی قوم کی طرح فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے۔ان سے تو بہتر ہماری آبادی ہے کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری تقدیس اور پاکیزگی کا اظہار واعلان وذکر کرتے ہیں لہٰذا خلیفہ بھی ہم ہی میں سے کسی کو مقرر فرما۔خداوند عالم نے ملائکہ کو جواب دیا انی اعلم مالا تعلمون۔جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اس واقعہ سے واضح ہوگیا کہ ارشاد خدا علم ہے دلیل ہے اس کی تعمیل واجب ہے۔جو خدا کہے اسے ماننا بھی ہے اس کا اقرار بھی کرنا ہے اس پر عمل بھی کرنا ہے اور ارشاد خدا کے خلاف جو کچھ ہے وہ عدم علم ہے۔نادانی ہے۔قیاس ہے اور قیاس نا قابل توجہ ہے اس کی بنیاد پر نہ ایمان ممکن ہے نہ اقرار ممکن ہے نہ عمل ممکن ہے ملائکہ چونکہ نافرمانی نہیں کرتے لہٰذا انہوں نے اپنے خیال کو چھوڑ دیا اور حکم خدا کو تسلیم کیا۔ملائکہ پر قیاس کا الزام اسی لیے نہیں ہے کہ انہوں نے اظہار خیال سے زیادہ کچھ نہیں

کیا اور اظہار خیال بھی شاید اسی لیے کیا کہ ہم کو قیاس کا جہالت ہونا معلوم ہو جائے اور خداوند عالم نے اسی لئے اپنی اور ملائکہ کی اس گفتگو کا ذکر بھی قرآن مجید میں کیا تا کہ ہماری ہدایت کا سامان فراہم ہو جائے۔

ملائکہ کے برخلاف قیاس کرنے والا اور قیاس کی داغ بیل ڈال کر انسانوں کو گمراہی میں ڈالنے والا شیطان ہے۔ جب خدا نے جناب آدمؑ کو سجدہ کا حکم دیا تو ملائکہ نے سجدہ کیا اور شیطان نے سجدہ نہیں کیا۔ صرف نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ حکم خدا کے مقابلہ میں اپنے قیاس کو پیش کیا کہ میرا آدمؑ کو سجدہ کرنا غلط ہے بلکہ آدمؑ مجھ کو سجدہ کریں یہ صحیح ہے۔ کیونکہ افضل کو کمتر سجدہ کرے۔ میں آدمؑ سے بہتر ہوں کیونکہ آگ سے بنا ہوں جو جہاں بھی جلائی جائے ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہے اور آدمؑ مٹی سے بنے ہیں جو جہاں بھی رکھی جائے ہمیشہ نیچے کی طرف آتی ہے۔ آگ کو مٹی پر فضیلت دینا شیطان کا قیاس تھا۔ اس قیاس سے دوسرا قیاس پیدا ہوا کہ شیطان جناب آدمؑ سے بہتر ہے پھر تیسرا قیاس پیدا ہوا کہ آدمؑ مجھ کو سجدہ کریں پھر چوتھا قیاس پیدا ہوا کہ شیطان نے جو نافرمانی کی وہ درست ہے بلکہ معاذ اللہ درحقیقت خدا کا حکم غلط ہے۔ پوری داستان کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ جو خدا کو غلط حکم دینے والا اور غیر عادل ثابت کر دے اس کا نام قیاس ہے کیا اس کے بعد کوئی اللہ والا قیاس کے قریب جائے گا اگر جائے گا تو خدا سے دور اور شیطان سے قریب ہو جائے گا۔

دوسرا واقعہ:

حضورؐ نے احد کے جہاد میں پہاڑی درہ پر پچاس تیرانداز مقرر کئے تا کہ دشمن

مسلمانوں پر پشت کی طرف سے حملہ آور نہ ہو سکے اور وضاحت فرمائی کہ تمہاری ڈیوٹی اس درہ کی حفاظت ہے چاہے ہم کو فتح ہو یا شکست ہو مگر جب دشمن کو شکست ہوئی اور وہ مال غنیمت چھوڑ کر میدان سے ہٹا تو چند پہرہ داروں کے علاوہ سب نے حکم نبیؐ کے خلاف اپنے قیاس سے طے کیا اب درہ کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے مگر دشمن بھاگا نہیں تھا ہٹ گیا تھا۔ مسلمانوں نے جہاد روک دیا۔ مال غنیمت پر جھکے۔ خالد ابن ولید نے درہ کی طرف سے حملہ کیا۔ تیرانداز پہرہ دار حکم نبیؐ کی مخالفت اور اپنے قیاس کی حمایت میں درہ چھوڑ کر جا چکے تھے جو دو پانچ باقی تھے ان کی لاشوں پر سے دشمن کے لشکر نے گذر کر مسلمانوں پر حملہ کیا۔ میدان چھوڑ کر ہٹ جانے والا دشمن کا لشکر بھی پلٹ پڑا۔ کڑا رن پڑا۔ مسلمان یا شہید ہو گئے یا میدان جہاد سے چلے گئے نبیؐ کے اکیلے محافظ علیؑ رہ گئے۔ نبیؐ زخمی ہوئے۔ جناب حمزہؑ شہید ہوئے۔ علیؑ زخمی ہوئے اور یہ سب کچھ نہ ہوتا اگر حکم نبیؐ کے خلاف قیاس پر عمل نہ کیا جاتا۔

تیسرا واقعہ:

وفات حضورؐ کے بعد جب حضرت علیؑ اور اہل بیت علیہم السلام اپنے حق سے محروم کر دیئے گئے تو انہوں نے احتجاج کیا۔ اپنے حقوق کے لیے دلائل دیئے کہ حکومت ہو یا جائداد فدک رسولؐ نے بحکم خدا علیؑ و فاطمہؑ کو دی تھی۔ حکم خدا و نبیؐ کے مقابلہ پر قیاس سے کام لیا گیا کہ نبیؐ نے ضرور چاہا تھا مگر عرب ایک گھر میں نبوت و حکومت کے جمع ہونے پر راضی نہ ہوئے۔ علیؑ و فاطمہؑ والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ قیاس ہی وہ حربہ ہے جو جناب امیرؑ کو محروم کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ حکم نبیؐ کو نبیؐ کی خواہش قرار دیا گیا اور اپنی

خواہش کو عربوں کی خواہش قرار دے کر حکمِ نبیؐ کے بالمقابل نافذ کر دیا گیا۔ قیاس کے بہت واقعات ہیں۔ سب کا بیان کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں ہے۔

چوتھا واقعہ:

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے ابوحنیفہ سے اسی بات کی شکایت کی تھی کہ جب تم کو حکمِ خدا نہیں معلوم ہے تو اس کے بجائے اپنے قیاس سے فتویٰ کیوں دیتے ہو یعنی فقہ جعفری کی بنیاد حکمِ خدا ہے اور فقہ حنفی کا سہارا قیاس ہے۔

ان چند تذکروں کے پیش نظر اگر ہم خدا والے ہیں۔ نبی والے ہیں۔ علیؑ والے ہیں۔ فاطمہؑ والے ہیں۔ امام صادقؑ والے ہیں تو ہم کو قیاس سے کوسوں دور رہنا چاہیئے اور ایمان و اقرار و عمل کی بنیاد صرف حکمِ خدا، ارشادِ رسولؐ اور حدیث معصومین علیہم السلام کو قرار دینا چاہیئے۔

مگر عام مومنین تو درکنار بعض محراب و منبر والے پیش نماز اور ذاکر حضرات بھی اکثر عقیدہ و عمل میں حکمِ خدا سے ناواقف ہونے اور قرآن و حدیث سے بے خبر ہونے کی بنیاد پر۔ مذہب کے بارے میں اپنی عقل و فکر کو دین کے لیے کامل و مکمل و کافی سمجھنے کی بنا پر قیاس سے کام لیتے ہیں حالانکہ کوئی خواب دلیل نہیں ہوسکتا۔ کسی غیر معصوم کا کوئی قول یا عمل دلیل نہیں بن سکتا۔ اصول دین اور قرآم مجید کے صریحی احکام کے خلاف کوئی رائے درست نہیں ہوسکتی۔ مذہب میں بھی اکثر ایسے بے بنیاد قیاس کئے جاتے ہیں۔ جیسے بے بنیادی قیاس سماجی زندگی میں رائج ہو جاتے ہیں مثلاً مرنے والا بدھ کر مرا ہے تو چار بدھ کو خاندان میں موتیں ہوں گی لہٰذا اگر چار چڑیاں مرنے والے

کے ساتھ دفنا دی جائیں یعنی چار موتیں مردے کے ہمراہ کر دی جائیں تو خاندان محفوظ ہو جائے گا اور ایسے سارے مہمل قیاسوں کے دلائل بھی اس طرح کے ہوتے ہیں کہ مثلاً فلاں خاندان میں فلاں شخص بدھ کو مرا تھا تو اس خاندان میں چار موتیں ہوئی تھیں یہ محض جہالت ہے قیاس ہے ورنہ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارا ایمان ہے کہ موت خدا کے ہاتھ میں جو نہ وقت سے پہلے آئے گی نہ وقت پر واپس جائے گا لہٰذا اگر مرنے والے مرے تو صرف اس لیے مرے کہ خدا نے ان کا مرنا طے کیا تھا اور اگر ایک موت کے بعد دوسری موتیں نہیں ہوئیں تو صرف اس لئے نہیں ہوئیں کہ خدا نے مزید موتوں کا نہ ہونا طے کیا تھا۔ بے چاری چڑیوں کی جہالت میں جان لینا اور چڑیا کے ذریعہ خدا کی طاقت کو روک کر موت سے بچ جانے کا خیال جہالت کا عروج ہے۔ ایسے تمام سماجی قیاس جہالت ہیں۔ جھوٹ ہیں ایمان و معاشرہ کے لئے باعث ہلاکت۔ تباہی میں تو تمام دینی قیاس اس سے زیادہ مہلک اور تباہ کن ہیں اور مذہب کے نام پر جہالت کو قائم رکھنا سب سے بڑی اور سب سے بری جہالت ہے لہٰذا عقائد میں ہم کو قرآن و حدیث کی پابندی کرنا ہوگی تا کہ ہم گمراہ نہ ہوں اور اقرار و عمل میں ہم کو اعلم فقیہ کی تقلید کرنا ہوگی تا کہ ہم حکم خدا کی تعمیل کرنے والے ہوں۔ جہالت کی حمایت کرنے والے اور اپنی بے عقلی کی عبادت کرنے والے نہ بن جائیں خدا کے بندے رہیں اور نبیؐ و امامؑ کے غلام رہیں ان کے بتائے ہوئے عقیدے رکھیں۔ ان کے دیئے ہوئے احکام کی تعمیل کریں ورنہ قیاس کے ذریعہ ہم اپنے ایمان و عمل کو گمراہ و تباہ کر لیں گے اور خدا کے غضب و معصومین علیہم السلام کی برہمی و ناخوشی و ناراضی کے مستحق قرار پائیں گے۔ نہ جاننا ایک عیب ہے اور جان لینے کے بعد بھی قیاس پر اعتماد کرنا سب سے بڑا عیب ہے۔ جہالت کو اپنانے سے بہتر

ہے اپنی جہالت کا اقرار کر کے خاموش ہو جانا اور علماء وفقہا کی طرف متوجہ ہو کر احکام خدا و نبیؐ و امامؑ جاننا اور عمل کرنا اگر دنیا میں مسلمان رہنا ہے اور مرنے کے بعد جنتی بننا ہے جس کی توفیق خدا ہم سب کو دے تو تمنا تب ہی پوری ہوگی جب عقیدہ وعمل میں قیاس کے بجائے علماء سے قرآن وحدیث کے مطابق عقائد معلوم کریں اور اعلم فقیہ کی تقلید کر کے مسائل معلوم کریں ان کے فتوے پر عمل کریں اور اپنے قیاس سے دور رہیں اور یاد رکھیں قیاس کا موجد شیطان ہے۔

چلو صدقہ نکل گیا

بلا دور ہوئی

مادیات کو روحانی رنگ ورخ دنیائے مذہب کا مقصد ہے۔ مذہب نہ مادہ کا منکر ہے نہ روح کا۔ وہ نہ روح کو فراموش کرنے دینا چاہتا ہے نہ مادیات کو ترک کرنے کی اجازت دیتا ہے بلکہ روح اور مادہ کی خوشگوار آمیزش والی زندگی کو انسانوں میں رائج کرنا چاہتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کھاؤ پیو۔ پہنو اوڑھو۔ کھلاؤ، باٹو۔ جی بھر کے نعمات ولذت دنیا سے فائدہ اٹھاؤ۔ البتہ ہر مزہ پر ہر لذت پر، ہر خوشی پر، ہر سکھ پر، ہر چین پر الحمدللہ کہتے جاؤ اور مالک کا شکر ادا کرتے جاؤ۔ رزق ملتا جائے اور رازق کا چرچا بڑھتا جائے۔ روزی بڑھتی جائے اور روزی رسان سے دل ودماغ کی وابستگی پکی ہوتی جائے۔ تاکہ دولت ملنے پر کردار میں غرور، بدمستی، مدہوشی، غاصبانہ ذہنیت، ظالمانہ روش، ایذا پسندی، عشق دنیا نہ پیدا ہونے پائے اور غربت چھا جانے پر احساس کمتری، بے حسی، بے حیائی، بھیک مانگنے کی عادت چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا مزاج، حسد، خدا اور خلق خدا سے نفرت نہ پیدا ہو جائے بلکہ دولت کے زمانہ میں غریبوں کی راحت رسانی کا جذبہ خوشنودی کے لیے تیز سے تیز تر ہو جائے۔ شہرت، خودنمائی کے جذبہ کے زیر اثر جو خدمت ہوتی ہے وہ ناپائدار ہوتی ہے۔ جتنا دیا جاتا ہے اس سے زیادہ احسان جتایا جاتا ہے۔ پہلے خوشامد

کرائی جاتی ہے بعد میں نمک حرامی کا تمغہ دیا جاتا ہے اور حصول شہرت کے جذبہ سے کی جانی والے خدمت خلق چڑ چڑے کے ساتھ گوشہ نشینی اور گم نامی پر ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شہرت کی ہوس کی تسکین نہیں ہوتی کیونکہ جس حاجت مند کی مدد کی گئی ہے اگر اس کی حاجت پوری ہوگئی تو اب وہ کیوں خوشامد کرے اور اگر نہیں ہوتی ہے تو اسے اب دوسرے پھول کی تلاش ہوگی جس سے رس چوسا جا سکے۔ شہد کی مکھیاں بھی صرف اپنے چھتے کو یاد رکھتی ہیں کب کس مکھی نے کس پھول کو رس چوسنے کے بعد یاد رکھا ہے اور جب پھول مرجھا کر گر جاتا ہے مکھیاں نہ پھول کے جنازے پر روتی ہیں نہ میت اٹھاتی ہیں نہ دفناتی ہیں بلکہ یا جانور سوکھے پھول کو چرتے ہیں یا ہوا پھول کے اجزا کو اس طرح منتشر کرتی ہے کہ پھول کے اجزا کو پھول سے کوئی نسبت نہیں رہ جاتی۔ البتہ اگر چھتہ گر پڑتا ہے تو مکھیاں اس کے گرد ہجوم رکھتی ہیں ہر شبہ پر ڈنک مارتی ہیں۔ خود مرتی رہتی ہیں۔ دوسروں کو کاٹتی رہتی ہیں لیکن ہر جدوجہد کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد کے بعد مکھیاں بھی غائب ہو جاتی ہیں لہٰذا خودنمائی کے جذبہ کے پیش نظر خدمت خلق کرنے والے نمک حراموں کو گالیاں دیتے دیتے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور جن کی خدمت کی جاتی ہے وہ خدمت کرنے والے کو اپنا محسن ماننے کے بجائے ہمیشہ ان کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں کہ ''جی انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے۔ جتنا کیا اس سے زیادہ تر بے گار لے لی اور جی حضوری کرالی اور جناب جو کچھ انہوں نے غریبوں میں بانٹا ہے وہ ان کا مال کب تھا۔ وقف بھیج کھایا تھا بھائیوں کا حصہ ہڑپ کر لیا تھا۔ خود عیش کرتے تھے۔ مرغ زریں کا پلاؤ تو خود کھاتے تھے۔ چٹنی ہم غریبوں کو چٹا کر ہماری چٹنی بناتے تھے۔ جب مر گئے تو خدا کو حساب دیں گے جس کا جس کا مال اور حق ہڑپ کیا ہے اس کی سزا پائیں گے اور ہم

غریبوں کا جو دل دکھایا ہے اس کی مار الگ پڑے گی۔'' یہ ہے ہوس شہرت کا دوطرفہ انجام اور سچ تو یہ ہے کہ ہر ہوس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اگر تسکین ہو جائے تو ہوس ہوس نہیں اور اگر ہوس ہوس ہے تو بھونرے اور پھول دونوں کی لاشیں اپنے اپنے مقام اپنی بے کسی پر خود ہی روتی رہتی ہیں اور زمانہ ہنستا کھیلتا آگے بڑھتا رہتا ہے لہٰذا اے انسانو نہ خوشامد پسند بنو نہ خوشامدی بنو بلکہ اگر غریب ہو تو خدا سے مانگو۔ امیر ہو تو غریبوں کی تلاش میں نکلو ان کی تکلیفیں دور کرو تا کہ خدا دنیا و آخرت میں تمہاری تکلیفیں دور کرے۔ عقیدہ خدا کے گرد جو دولت یا غربت گردش کرتی ہے وہ خودشناسی اور خداشناسی کے باعث نہ مغرور ہوتی نہ عالم و غاصب۔ نہ گداگر ہوتی ہے نہ بدچلن و راہ زن۔ بلکہ شکر و صبر اس کی منزل، ہمت و ایثار اس کی راہ آخرت پر نظر۔ خدا سے راز و نیاز اور بندوں سے بے نیاز جو خدا سے لیا اس کے بندوں کو دیا اور سجدہ شکر ادا کیا۔ خدا سے مانگا۔ جو ملا اس پر راضی، جو نہیں ملا اس پر ناراض نہ شاکی، ملا تو بندوں کو دکھایا نہیں۔ نہیں ملا تو بندوں کو بتایا نہیں۔ دیا تو چھپا کر دیا لیا تو دل برسوں دعا دیتا رہا۔ زبان کھولی نہیں۔ شرم بیچی نہیں نیکی کو نیکی رکھا۔ ثواب کی تمنا کی۔ عذاب سے ڈرتے رہے۔ امیر و غریب آپس میں گلے ملتے رہے۔ مصافحہ کرتے رہے۔ دن دھاڑے حاجت روائیاں ہوتی رہیں مگر اس طرح چپ چپاتے کہ ہاتھ کی ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ دینے والے کو خود ہی نہیں معلوم ہو سکا کہ کیا دیا۔ کس کو دیا اور کبھی لینے والے کو پتہ نہیں چل سکا کہ دینے والا کون تھا اور کیا دے گیا۔ دینے والے اور لینے والے دونوں صرف خدا کو دیکھ رہے ہیں دونوں سجدہ شکر میں ہیں ایک خدا سے عمل قبول کر لینے کی بھیک مانگ رہا ہے دوسرا شکر ادا کر رہا ہے کہ مالک تو نے میری آبرو رکھ لی اے ستار العیوب جس کے ذریعہ تو نے میرا بھرم کھلنے نہیں دیا دنیا

وآخرت میں اس کا بھرم رکھنا۔ یہ ہے مادیات کی وہ روحانی خوشگوار آمیزش، جو مقصد مذہب ہے۔ جنھوں نے مذہب کے اس مقصد کو اپنالیا وہ ہر حال میں مطمئن ہے پریشانیاں پریشان نہیں کہ یہ کیوں پریشان نہیں ہوتے اور جنھوں نے مذہب کے اس مقصد کو نہیں اپنایا وہ ہر حال میں پریشان ہیں اور ہمیشہ پریشان رہیں گے کبھی مطمئن نہ ہوں گے صرف شیطان مطمئن ہے کہ دین مان کر بھی کبھی دیندار نہ ہوں گے۔

یہ لوگ مذہب کو بھی خالص مادی بنانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ مذہب کے روحانی حصہ کو فنا کر کے صرف مادی حصہ کو مذہب مانتے ہیں۔ ان کا مادی مذہبی انداز فکر پوچھتا ہے کہ نماز سے اس دنیا میں کیا فائدہ۔ روزہ کا مادی فائدہ بتلائے۔ حج سے ہماری آج کی زندگی کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ زکوۃ، فطرہ، خمس واجب کرنے والے مذہب نے کیا یہ بھی سوچا تھا کہ مسلمان کبھی غیر اسلامی حکومت میں بھی رہیں گے جہاں ان کو خمس، فطرہ، زکوٰۃ شرعی ٹیکس کے علاوہ حکومت کا ٹیکس بھی دینا ہوگا۔ مختصر یہ کہ مادی مذہبی اندازفکر یہ ہے کہ مذہب کا اس دنیا میں فائدہ بتلائے آخرت جب آئے گی تب آ گئے گی۔ مذہب کی بات کرنا ہے تو آج کی بات کیجیے۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ یہ نان اسٹاپ بولنے والے چپ ہوں تو مذہب اپنی بات کہے۔ یہ اتنے تنگ مزاج ہوتے ہیں کہ اپنے سوال کا جواب صرف یس اور نو میں مانگتے ہیں تاکہ مذہب جب کہے کہ ہمارے ماننے کا فائدہ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ہے تو مذہب کے اس یس کو نو کہہ کر زبان بندی کر دیں حالانکہ وہ اپنے ذہن کے پٹ بند رکھتے ہیں اور بس ناسمجھی پر بضد انسان صرف اپنا نقصان کرتا ہے وہ سمجھانے والے کا کیا بگاڑے گا اس کے باوجود جب ان سے گذارش کیجیے کہ پھر غریب مذہب کی جان چھوڑ دیجیے۔ اپنے منکر مذہب ہونے کا اعلان کر دیجیے تو پینترا

بدل کر گفتگو شروع کر دیتے ہیں کہ جناب ہم مذہب کے منکر نہیں ہیں البتہ جو سمجھ میں نہیں آتا ہے اسے نہیں مانتے ہیں ورنہ ہم کیا نہیں کرتے، خمس نہیں نکالتے ہیں مگر اس سے زیادہ خیرات کرتے ہیں۔ زکوٰۃ فطرہ کے پابند نہیں ہیں مگر غریبوں کی بے دریغ مدد کرتے ہیں۔ اپنی تعلیم میں حصہ نہیں لیتے مگر ہماری مدد سے نہ معلوم کتنے ڈاکٹر، انجینئر بن گئے۔ مولوی صاحب خدا نیکی دیکھتا ہے آپ لوگ قاعدہ قانون دیکھتے ہیں کہ مالی سال کا دن معین کیا یا نہیں۔ سال کے آخری دن جو بچت تھی اس کا حساب کر کے خمس نکالا یا نہیں اور جو نکالا اسے قواعد شرعیہ کے مطابق خرچ کیا یا نہیں۔

ہم جناب جو سمجھ میں آجاتا ہے اس سے بھاگتے نہیں اور فضول چکروں میں پڑتے نہیں۔ یعنی یہ حضرات احکام خدا کے بجائے اپنی سمجھ کے احکام کو دین مانتے ہیں۔ اور من مانی کو مذہب قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ آخرت پر بھروسہ نہیں رکھتے مگر نئے کام نئے مکان کی ابتدا کرتے وقت نذر دلائیں گے۔ خیرات کریں گے تاکہ کاروبار میں نقصان نہ ہو۔ مکان منحوس نہ ہو جائے۔ کاروباری سال کے پہلے دن مولوی صاحب کو بلا کر حصول برکت کے لیے کھانے پر بسم اللہ لکھوائیں گے۔

یہ لوگ دنیا کے نفع کے علاوہ کسی نفع کے نہ قائل نہیں نہ خواہش مند لہٰذا دنیاوی نقصان سے بچنے کے لیے دین کو بھی ماننے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ واجب حق نہیں دیتے تو سنت صدقہ اور مستحب کار خیر کیا کریں گے۔ البتہ جب نقصان ہو جاتا ہے تو اس کو خدا کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً گلاس ٹوٹ گیا۔ سامان کھو گیا۔ مال چوری ہو گیا تو یہ کہہ کر صبر کر لیتے ہیں اور دوسرے کو تسلی دیتے ہیں چلو صدقہ نکل گیا۔ حالانکہ صدقہ وہ ہے جو نکالا جائے نہ کہ جو نقصان ہو جائے اسے مری بچھیا برہمن کے نام کے اصول پر صدقہ دے دیا

جائے۔ یہ بغیر مادی فائدہ کے اللہ کو خوش کرنے کے لیے کچھ دینا جانتے ہی نہیں۔ اگر ان کے پاس چندہ لینے جاؤ تو ان کا جواب ہوگا جناب آج ہی پچاس ہزار کے نقصان کی خبر آئی ہے اللہ نے اپنے حق سے زیادہ اپنا حصہ لے لیا اب آپ کو اس کی راہ میں کیا دیں۔ ان مادہ پرست اقرار دین کرنے والوں سے وہ مادہ پرست بہتر ہیں جو منکر دین ہیں۔ کم از کم ان کی روش ان کے انکار سے ہم آہنگ تو ہے۔

افسوس تو ان بے چاروں پر ہے جس کے قول و فعل میں تضاد رہے۔ جو لاعلمی کو علم سمجھ بیٹھتے ہیں جو دین کو سمجھنا نہیں چاہتے اور اعتراض کرنے کو دین ماننے کے منافی نہیں سمجھتے یہ خواہشات کے دلدل میں دھنسے ہیں اور نکلنا نہیں چاہتے یہ دنیاوی نفع ہی کو ثواب سمجھتے ہیں اور دنیاوی نقصان ہی کو صدقہ سمجھتے ہیں یعنی نزول بلا کو رد بلا سمجھتے ہیں۔ وارننگ کو انشورنس سمجھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے اگر کہا جائے کہ جس تختہ پر سولی دی جائے گی وہ سونے کا ہوگا جس جس زنجیر میں لٹکائے جاؤ گے وہ کئی من سونے کی ہوگی۔ اور یہ سب سونا سولی کے بعد تمہاری ملکیت ہوگا تو ان کی آوازیں بلند ہوں گی پہلے سولی ہم کو دو۔ اور لائن لگ جائے گی سولی کے عاشقوں کی۔ سولی کے لیے بھی گھپلے بازی سے باز نہیں آئیں گے۔ آپ اس مثال کو صرف مثال نہ سمجھیں بلکہ عاشقان دنیا زرین اور سلکن زندگی کے لیے عذاب کی سولی کے لیے لائن لگائے کھڑے ہیں۔

اگر ان لوگوں سے کہا جائے تم بلاؤں میں گھرے ہو۔ مال حرام، غصب حقوق، ظلم، ایذا رسانی، والدین، اعزا، احباب، مومنین، امامؑ، نبیؐ اور خدا کی حق تلفی کے باعث آگ ہر طرف سے تمہاری طرف بڑھ رہی ہے۔ اپنے کو بچاؤ۔ تو یہ سب سے بڑا صدقہ ہے۔ ادائیگی حقوق مقبول صدقے یہں اور صدقہ بلا کو دور کرتا ہے تو یہ لوگ آپ کو یا

گونگے بہرے دکھائی دیں گے یا پھر حملہ آور ہو جائیں گے سمجھانے والا ڈھیلا مار نہیں سکتا۔ یہ چمکارنے پر قابو میں آ نہیں سکتے مومن دنیاوی نقصان۔ دنیاوی ناکامی، بیماری، محرومی وغیرہ کے ذریعہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ بلا قریب ہے صدقہ و عمل صالح وصحت مند ایمان کے ذریعہ بلا کو دور کرو۔ مگر یہ دنیا کے متوالے دین کے ماننے والے نقصان کے بعد خدا سے اور دور ہو جاتے ہیں اور یہ کہہ کر سو جاتے ہیں چلو صدقہ نکل گیا۔ بلا دور ہو گئی اور نہیں جانتے کہ یہ شیطان کی لوریوں میں سے ایک لوری ہے۔

نبیؐ و امامؑ اور فقیہ کا فرق

جہالت سے بڑھ کر کوئی خرابی کوئی عیب، کوئی نقص نہیں ہے۔ کریلا اس وقت نیم پر چڑھ جاتا ہے جب ہم اپنی جہالت کو علم سمجھنے لگتے ہیں۔ جہالت کے ہاتھوں بے شمار حماقتی لطیفے ظہور پذیر ہوئے ہیں جن پر صاحبان عقل ہمیشہ ہنستے رہے ہیں مگر بیچارہ جاہل اپنی ہنستی بھی اڑواتا ہے۔ اور ہنستی کو داد وثنا وصفت بھی سمجھتا رہتا ہے۔ مشاعروں میں تقریری مقابلوں میں ہوٹنگ کو بخیال خود صاحبان کمال تعریف ہی سمجھتے ہیں اور اپنی جاہلانہ روش پر جھومتے رہتے ہیں۔ پہلے ناواقفیت کے چند مضحک نمونہ سن لیں۔ وہ بڑھی بڑھے اپنی پچاس سالہ پرانی شادی کے تذکرہ کو زندہ کررہے تھے۔ بڑھے نے کہا ہماری شادی میں بہت خرچ ہوا تھا۔ میرے خیال میں سو روپیہ خرچ ہوگئے تھے۔ بڑھی نے کہا ہٹو تم کو کبھی عقل نہیں آئے گی۔ سو نہیں بلکہ ساٹھ روپیہ خرچ ہوئے تھے۔ بڑھی کو سو اور ساٹھ کا فرق نہیں معلوم تھا۔ اس کو صرف آواز اور صوتیت کے سہارے سو کم معلوم ہوئے کیونکہ سو کا لفظ زبان سے ہلکے انداز میں ادا ہوجاتا ہے اور ساٹھ میں ٹ اور ھ پر زور دے کر بولنے سے ساٹھ کا لفظ بڑھی کو سو سے زیادہ معلوم ہوئے۔ بڑھا بھی سو اور ساٹھ کے فرق سے بے خبر تھا۔ چنانچہ اپنی عالمہ بڑھی کے سامنے سرنگوں ہوگیا۔

اسی طرح ایک گاؤں کے باشندے کی نظر میں تھانیدار سے عظیم کوئی مخلوق ہی نہ تھی۔ کیونکہ پورا گاؤں اس کے نام سے لرزتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک کمشنر کو بوقت

ملاقات دعا دیدی کہ خدا آپ کو تھانیدار کردے۔ سب ان کا منہ دیکھ رہے تھے اور وہ خوش تھے کہ ہم نے اتنی اونچی دعا دیدی کہ لوگ حیرت زدہ ہیں۔

اس سے اونچی سنیئے۔

چند جاہلوں کے درمیان خدا کا ذکر ہورہا تھا۔ ایک نے اپنا تصور پیش کیا۔ کہ خدا کے دونوں طرف ایک ایک گڑ کی بھیلی رکھی ہوگی جب چاہتا ہوگا ادھر سے کھاتا ہوگا۔ جب چاہتا ہوگا ادھر سے کھاتا ہوگا۔ (معاذ اللہ)

دوسرا بولا۔ خدا گڑ کھائے گا جو منہ میں چپک جاتا ہے۔ نہیں وہ تو مخمل کھاتا ہوگا۔ (نعوذ باللہ)

آپ ان مہملات پر جتنا بھی ہنسیں وہ کم ہے مگر جن کے یہ شاہکار ہیں وہ ان پر نازاں تھے۔ اور کوئی ان کے ناز اور غرور کو کم نہیں کرسکا۔

اور سنئے ایک حکیم نے اپنے مریض کی بدپرہیزی کی گرفت کی کہ تم نے سنگترہ کھائے ہیں اسی لیے کھانسی آرہی ہے اور تم میری دوا کو نقصان پہنچانے کا ناحق ملزم قرار دے رہے ہو۔ بات سچی تھی مریض نے اقرار کرلیا۔ بے عقل جاہل شاگرد نے پوچھا کہ کیسے پتہ لگ گیا کہ مریض نے سنگترہ کھائے تھے حکیم نے کہا بھائی کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس کے تکیہ کے نیچے سنگترہ کے چھلکے تھے۔

شاگرد حکیم صاحب کے مرنے کے بعد حکیم ہوگئے۔ مریض نے شکایت کی دوا نے نقصان کیا ہے۔ فوراً ان جاہل صاحب نے جھانکا کہ تکیہ کے نیچے کیا ہے۔ نمدہ بچھا دیکھا۔ فرمایا تم نے نمدہ کھایا ہے۔ لوگ ہنستے رہے مگر جاہل اپنی جہالت کی اکڑفوں میں رہا۔

اسی طرح ایک شخص اپنے اونٹ کو ایک حکیم کے پاس لایا کہ یہ تربوز کے کھیت میں چر رہا تھا کہ ایک دم سے چیخا۔ میں دوڑ کر پہنچا تو اس کی گردن پھول گئی ہے۔ سانس میں دقت ہے۔ اونٹ مرنے کے قریب ہے۔ آپ جلد اس کا علاج کریں حکیم نے اونٹ کو زمین پر لٹانے کا حکم دیا اور اس کی گردن کے پھولے ہوئے حصے پر مونگری مارنا شروع کی ہر مونگری پر ورم کم ہوتا گیا اور منٹ بھر میں اونٹ اچھا ہوگیا۔ کیونکہ ایک تربوزہ اس کے گلے میں پھنس گیا تھا۔ مونگری نے تربوز توڑ دیا۔ جاہل شاگرد کو ایک گھینگے کا مریض ملا۔ انہوں نے مریض کے گلے کو مونگری سے نوازنا شروع کر دیا۔ مریض رخصت ہوگیا۔ مرض باقی رہا۔

ایسے ہی بے شمار پر حماقت لطیفے ہیں جو جہالت کے ہاتھوں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مضمون بھی ایک پرانا واقفیت تحریر کا نتیجہ ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو۔

''شیعہ مذہب کے فقیہ اعظم امام جعفر صادق علیہ السلام ہیں۔ ان کے بعد ہم کو کسی فقیہ کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس عبارت کو پڑھ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ مومنین کی خدمت میں اس حقیقت کو پیش کیا جائے کہ نبی و امامؑ اور فقیہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی فقیہ کبھی نبیؐ یا امامؑ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح نبیؐ و امامؑ کو فقیہ سمجھنا درجہ نبوت و امامت کی توہین ہے۔

غدیری تقاضے

حقیقت خود حقیقت ہوتی ہے۔ چاہے مانی جائے۔ چاہے نہ مانی جائے۔ اسی طرح اگر کوئی بے حقیقت بات مان بھی لی جائے تب بھی وہ حقیقت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ مثلاً خدا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اگر ساری دنیا اس حقیقت کی منکر ہو جائے تب بھی اس کی واقعیت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوگا۔ بلکہ جو معترف ہوگا۔ اس کا اعتراف اس کو سچا بتا دے گا اور جو منکر ہوگا اس کا انکار اس کو غلط اور باطل بنا دے گا۔ یہی حال یہی اصول نتیجہ ہر حقیقت کے لیے ہے۔ اس میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ معاملات چاہے دین کے ہوں یا دنیا کے ہوں۔ باپ ہر حال میں باپ ہے نہ ماننے والا بیٹا نالائق کہلائے گا اور ماننے والا لائق قرار پائے گا۔

باپ کو باپ ماننے نہ ماننے کا کوئی اثر باپ پر نہیں پڑے گا کچھ اثر پڑے گا وہ بیٹے ہی پر پڑے گا۔ یہ بات بھی خوب سمجھ لینا چاہئے کہ حقیقت جاننے کے لیے ثبوت درکار ہوتے ہیں ورنہ درحقیقت ثبوت کو خود حقیقت پیدا کرتی ہے۔ خود ثبوت میں حقیقت کو پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ یہ بات کوئی دقیق بات بھی نہیں ہے۔ مثلاً دھواں اس بات کا ثبوت ہے کہ آگ سلگ رہی ہے اور آگ سلگ رہی ہے یہ حقیقت ہے۔ آگ نے دھویں کو پیدا کیا ہے۔ دھویں نے آگ کو نہیں پیدا کیا ہے۔ ہم کو آگ کے وجود کا علم دھویں کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ دلانا اس لئے ضروری تھا کیونکہ

منکر مزاج اور ضدی طبیعتیں ثبوت کی رٹ لگاتی ہیں اور ثبوت نہیں ملا کی ہٹ پر اتراتی ہیں۔لیکن کسی کو اگر کسی بات کا ثبوت نہیں ملا تب بھی اس کو حق سے انکار نہیں ہے۔صرف وہ اقرار سے اپنے کو آزاد رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ ثابت نہ ہونے سے نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا ہے۔عدم ثبوت بہر حال ثبوت عدم نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ۱۰؍ذی الحجہ ۱۰ھ کو حضور سرور کائنات جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم کے میدان میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمانوں اور حاجیوں کے درمیان مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔اس اعلان کو زبان حال سے بھی پیش کیا۔اپنے اقوال سے بھی پیش کیا اور سب کو حضرت علیؑ کے پاس بھیجا بھی تا کہ ہر شخص فرداً فرداً آپ کے امیر المومنینؑ ہونے کا اقرار کرے اور سب نے بلا استثنا شخصے یہ اقرار کیا بھی۔ اصحاب، مہاجرین، انصار، ازواج پیغمبر غرضکہ کوئی باقی نہ رہا جس نے جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو ارشاد پیغمبر اور حکم خدا کے مطابق اپنا امیر نہ مانا ہو۔

ائمہ معصومین علیہم السلام نے لفظ امیر المومنین کو ذات علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کے لیے مخصوص کر دیا اور ممانعت کر دی کہ کسی امامؑ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال نہ کیا جائے تا کہ شک وشبہ، مجاز اور مبالغہ وغیرہ کی تمام راہیں بند رہیں۔ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا جانشین پیغمبر ہونا۔امام ہونا وصی پیغمبر ہونا، ولی خدا ہونا، حجۃ خدا ہونا۔اسلام اور مسلمانوں کا دینی و دنیاوی پیشوا اور سربراہ ہونا اتنی ہی سچی اور ثابت حقیقت ہے جتنا سچا یہ واقعہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حالات نے آپ کو پیشوائی اور سربراہی کے حق سے محروم رکھا تفسیر وحدیث وتاریخ کی کتابیں اس تذکرہ سے

بھری پڑی ہیں معلوم کرنا اور اعتراف کرنا ہمارا فرض بھی ہے اور ہماری ضرورت بھی ہے۔ یہاں ثبوت پیش کرنا پیش نظر نہیں ہے۔تاریخ احمدی سے لے کر الغدیر تک ہزاروں کتابیں اس موضوع پر ہر زبان میں موجود ہیں۔جن کو نہیں معلوم ہے وہ معلوم کریں اور مانیں۔البتہ جن کو غدیری اعلان معلوم ہے نہ صرف معلوم ہے بلکہ یہ اعلان ہر طرح تسلیم ہے ان کا فرض ہے کہ سوچیں کہ خدا نے ختم نبوت کے بعد سلسلہ امامت کو کیوں جاری کیا۔حضرت علیؑ کو نبیؐ کا جانشین کیوں بنایا۔اور آپ کے بعد گیارہ امام کیوں مقرر کئے۔ بارہویں کے ذریعہ امامت کو آج بھی کیوں زندہ اور باقی رکھا ہے۔ یہ ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جن کی بنیادی وجہ کو جاننا ہمارا فریضہ ہے۔

وجہ صرف ایک ہے بے شک دین کامل ہے۔لیکن قیامت تک تشریح قانون کی ضرورت باقی ہے اور مکمل قانون بھی بے فائدہ ہے اگر وہ نافذ نہ ہو سکے افراد اور سوسائٹی کی زندگی پر اگر قانون کی گرفت مکمل طور پر نہیں ہے تو قانون و دین کا فائدہ بھی پورے طور پر حاصل نہ ہوگا۔لہٰذا قیامت تک سلسلہ امامت کو اس لئے باقی رکھا گیا تا کہ قانون کی صحیح تشریح ہوتی رہے۔اور اس کو نافذ بھی کیا جائے۔ظہور امام مہدی علیہ السلام کا دن نفاذ قانون کی تکمیل کا دن ہوگا حکومتیں طاقت کے ذریعہ قانون نافذ کرتی ہیں اور دین تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ قانون کو نافذ کرتا ہے۔زمانہ غیبت عہد مہلت وفرصت ہے تا کہ تبلیغ وتعلیم کے حدود مکمل ہو جائیں تبلیغ وتعلیم کے حدود کی تکمیل کو ہی اتمام حجۃ کہا جاتا ہے۔ حضورؐ کو اسلام پیش کئے ہوئے ۱۴؍سو سال سے زیادہ مدت ہو چکی ہے لیکن اب بھی قانون الٰہی بہت کم نافذ ہے۔اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین اور قانون کا نفاذ طاقت کے ذریعہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ تعلیم وتبلیغ کو نفاذ کا ذریعہ مقرر ومعین کیا گیا۔لہٰذا جو لوگ غدیر

کی بات نہیں مانتے۔ان سے کچھ کہنا نہیں ہے۔البتہ جو غدیر کے اعلان کو دل وجان سے مانتے ہیں۔ان سے سوال ہے کہ وہ اسلام کے قانون کو اپنی زندگی میں۔اپنی فیملی اور خاندان کی زندگی میں اپنی سوسائٹی اور قوم کی زندگی میں کیوں نافذ نہیں کرتے۔کیا پابند دین ہونے کے لیے خدانخواستہ ان کو بھی کسی آسمانی عذاب کا انتظار ہے۔یا معاذ اللہ ان کو بھی بارہویں امام کی تلوار کا انتظار ہے۔اگر بغرض ایسی کوئی بات ہے تو یقیناً ان کے دل نے غدیر کے اعلان کو نہیں مانا ہے۔ورنہ غدیری اعلان کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم نہ صرف اپنی زندگی میں۔اپنے خاندان کی زندگی میں۔اپنی قوم اور سوسائٹی کی زندگی میں اسلامی قوانین کو نافذ کریں بلکہ غیروں کو اپنائیں۔غدیری حلقہ کی توسیع میں حصہ لیں اور دوسروں میں بھی غدیری اسلام کو نافذ اور جاری وساری کریں۔لیکن بے نمازی ہم ہیں۔بے روزہ دار ہم ہیں، زکوٰۃ وخمس کو ہضم کر جانے والے ہم ہیں۔گھر میں اپنے رفقا حیات کو ستانے والے ہم۔ماں باپ کو دل تنگ کرنے والے ہم ہیں۔ مومنین کو دھمکانے والے ہم ہیں۔مسلمان نہ ہماری زبان سے محفوظ ہیں نہ ہمارے ہاتھوں سے محفوظ ہیں۔اس صورتحال کے پیش نظر تو ہم معمولی مسلمان بھی نہیں ہیں چہ جائیکہ غدیری مسلمان ہونا لہٰذا غدیر کو ماننے والی قوم سے اعلان غدیر تقاضہ کر رہا ہے کہ دین کو ہر زندگی میں نافذ کرو۔ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم کو غدیر کے منکروں کے صف میں تمہارا عمل کھڑا کردے۔اور دوزخ میں کھڑے ہونے سے بدتر ہے غدیر کے منکروں کی صف میں کھڑا ہونا۔

فاطمہؐ

یعنی ایک فیصلہ کن ذات

خاتون جنت جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کی ذات ۲۰؍جمادی الاخریٰ ۵؍بعثت میں ہوئی۔یعنی ہجری سن شروع ہونے سے ۸؍سال قبل۔ایک روایت کی بنا پر آپ کی شہادت بھی اسی مہینہ کی ۳؍تاریخ کو ہوئی ہے۔اس طرح اگر جمادی الاخریٰ کو شاہزادی کا مہینہ اور رجب کو مولیٰ کا مہینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا شعبان کو حضورؐ اور رمضان کو خدا نے اپنا مہینہ کہا ہے۔اس طرح ایک تسلسل قائم ہوجاتا ہے۔روایتوں کا اختلاف ختم نہیں ہوسکتا۔البتہ کوئی محقق اپنا قول فیصل دے کر کسی روایت کی صحیح اور کسی روایت کو غلط قرار دے سکتا ہے۔چنانچہ یہ بات بھی زیر بحث ہے کہ آپ حضورؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں یا آپ کی تین بہنیں اور تھیں جن کے نام زینبؑ، ام کلثومؑ اور رقیہ ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تینوں لڑکیاں حضورؐ کے گھر میں پلی بڑھی اور پروان چڑھی تھیں اور ان کے غم نے حضور کو بہت مغموم کیا تھا۔لیکن یہ حضورؐ کی بیٹیاں تھیں یا جناب خدیجہؑ کی لڑکیاں تھیں یا جناب خولہ کی لڑکیاں اور جناب خدیجہؑ کی بھانجیاں تھیں یہ بات اختلافی ہے اور اختلافی رہے گی۔لیکن اس سلسلہ کا سب سے جامع اور مانع اور مکمل فقرہ مولانا عینی شاہ نظامی کا ہے جو مصور فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے شاگرد تھے اور حیدرآباد

میں مقیم تھے۔انہوں نے اس موضوع پر لکھا تھا کہ رسولؐ کی بیٹی ہونا اور ہے اور فاطمہ زہراؑ ہونا اور ہے ۔آپ کے کمالات نے آپ کو فاطمہ زہراؑ بنایا ہے۔صرف رسولؐ کی بیٹی ہونے نے آپ کو فاطمہ زہراؑ نہیں بنایا۔کسی نے اسی وزن اور قافیہ میں یہ بھی اچھی بات کہی ہے کہ شریک حیات پیغمبر نہ تھیں بلکہ رفیق مقصد نبوت بھی تھیں۔شاہزادی کے سلسلہ میں کسی مختصر مضمون میں کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے مگر اتنا ذکر تو کم از کم کرنا ہی ہے کہ آپ جب تشریف لے جاتی تھیں تو حضور آپ کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے۔حضورؐ کا یہ قیام احترام تھا۔اہتمام تھا۔محبت تھا،اعزاز تھا یا سب کچھ تھا۔اسے حضورؐ ہی بہتر جانتے ہیں لیکن ہم پر حضورؐ کی تاسی لازم ہے لہٰذا شاہزادی کا احترام کرنا۔آ کی ذات کے لیے اہتمام کرنا،آپ کے کردار سے محبت کرنا۔آپ کی تعظیم کرنا ہم مسلمانوں کا فرض ہے۔

حضورؐ کا ایک خصوصی طرز عمل اور بھی تھا کہ آپ جب سفر پر روانہ ہوتے تھے تو سب سے رخصت ہوتے ہوتے سب کے آخر میں اپنی بیٹی سے ملتے تھے اور جب سفر سے واپس آتے تھے تو سب سے پہلے باپ بیٹی ہی کا چہرہ دیکھتا تھا۔

آپ کے بارے میں حضورؐ کی بے شمار حدیثیں کتب حدیث میں موجود ہیں خصوصاً صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا فاطمہؑ میرا ایک حصہ ہے۔جس نے فاطمہؑ کو غضب ناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا۔اس حدیث اور دوسری حدیثوں کی روشنی میں آپ کی ذات گرامی ایک ''فیصلہ کن'' ذات ہے۔آپ جس پر ناراض اور غضبناک ہوجائیں اس کا شمار مغضوب علیہم میں ہوجائے گا جبکہ ہم ہر نماز میں مغضوب علیہم اور ضالین سے بچنے کی دعا مانگتے ہیں۔

اگلی پچھلی شخصیتوں کے حق باطل ہونے کے لیے یہ دیکھنا کافی ہوگا کہ شاہزادی

اس سے ناراض ہیں یا نہیں جس طرح جناب ابوذر کے لیے حضورؐ نے فرمایا کہ زمین کے اوپر آسمان کے نیچے ابوذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں ہے۔اس حدیث نے جناب ابوذر کی شخصیت کو فیصلہ کن بنادیا ہے۔کدھر حق ہے کہ ہر باطل ہے اس کی ایک پہچان یہ ہوگی کہ دیکھا جائے کہ ابوذر کدھر ہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ جناب ابوذر کے لیے ہر شخص ناقابل برداشت تھا جو اسلام کے احکام کا پابند نہ ہو اور یہ بھی سب جانتے ہیں شاہزادی فاطمہ بھی اس سے بیزار ہوجاتی تھیں جو دین کے احکام کے سامنے سر نہ جھکائے بلکہ اپنے مقصد کے لیے دین میں نئی نئی باتیں پیدا کرے۔

لہٰذا اگر ہم غضب خدا،غضب نبیؐ،غضب فاطمہؑ،غضب امام،غضب ابوذر سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم کو ہر حکم دین کی تعمیل کرنا ہوگی اور دین میں طرح طرح کی نئی باتیں پیدا کرنے سے گریز کرنا ہوگا اور ان لوگوں سے اپنے کو الگ رکھنا ہوگا جو دین میں یا مومنین میں رخنہ ڈالیں۔

ہر حال میں خدا کی مطیع رہو

امام حسنؑ کا پیغام غلاموں کے نام

پہلے امام حضرت علی علیہ السلام خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے جدھر منھ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے اور دوسرے امام حضرت حسن علیہ السلام ۱۵؍رمضان کو پیدا ہوئے جس کا روزہ واجب ہے۔ فروع دین میں اول نماز ہے جس کی طرف پہلے امامؑ کی ولادت اور دوسرے روزہ ہے جس کی طرف دوسرے امام کی ولادت رہبری کرتی ہے۔ حدیث میں دین کے دو حصے بیان ہوئے ہیں۔ آدھے کا نام صبر ہے اور آدھے کا نام شکر ہے۔

امام حسنؑ کی زندگی دین کے دونوں حصوں کی ایسی یکجا تشریح کرتی ہے کہ آدمی ششدر اور مبہوت رہ جائے کیونکہ حضرت کو غیر معمولی صبر بھی کرنا پڑا اور غیر معمولی شکر بھی آپ نے ان مصائب میں انجام دیا۔ تفسیر میں ذکر ہے کہ صبر کی تین قسمیں ہیں۔ مصیبت میں صبر کرنا۔ خدا کی اطاعت کرنے میں خواہشات و حالات سے مقابلہ کرتے ہوئے صبر کرنا اور حرام سے بچنے کی کوشش میں اندرونی جذبات اور بیرونی حالات سے جنگ کرتے ہوئے صبر کرنا۔ سب سے کم درجہ ہے مصیبت میں صبر کرنے کا اور سب سے بڑا درجہ ہے حرام سے بچنے میں صبر کرنے کا ہے۔

امام معصوم ہوتے ہیں لیکن عصمت نہ پیدائشی ہوتی ہے جیسی کہ ملائکہ میں

ہوتی ہے نہ مجبوراً معصوم ہوتا ہے بلکہ اپنے کامل علم و مکمل عرفان کے باعث اپنے پورے ارادہ و اختیار کو صرف کرتے ہوئے زندگی کی پہلی سانس تک معصوم ہوتا ہے اس سے گناہ سرزد نہ ہوسکنے کا ایسا اعتماد ہوتا ہے کہ عالم الغیب خدا ان کے معصوم ہونے کی خبر دیتا ہے اور ان کے معصوم ہونے کی ضمانت دیتا ہے۔ ان کی عصمت ہی کی بنیاد پر ہدایت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے ان حقائق کے پیش نظر ہر شخص پورے طور پر محسوس کرسکتا ہے کہ ایک معصوم کو زندگی بھر جہاد کرنا پڑتا ہے۔ ایک انسان ہونے کے باوجود جذبات و احساسات خواہشات تعلقات، حالات، اچھے برے لوگوں کے برتاؤ، مصائب، ایذا رسانیاں غرض کہ دنیا کی کوئی چیز اس کے ستون عصمت میں معمولی سے معمولی جنبش بھی پیدا نہیں کرسکتی۔

جس معصوم کو جیسے سخت اذیت ناک حالات کا سامنا کرنا ہوگا اتنا ہی سخت اس کا امتحان ہوگا۔ اتنا ہی سخت اس کا جہاد ہوگا۔ اتنی ہی عظیم اس کی منزلت ہوگی۔ بے شک امام حسین علیہ السلام کی شہادت بے مثال اور بے نظیر ہے لیکن حساس انسان محسوس کرسکتا ہے کہ امامؑ کے لیے لمحات جہاد آخر اور شہادت سخت ترین ہونے کے باوجود اتنے سخت نہ تھے جتنے سخت لمحات وہ تھے جو آپ نے اپنے جہاد و شہادت کے قبل عاشورہ کے دن اپنے اصحاب و اعزا و اولاد کی شہادت کے مواقع پر گذارے۔ اس لیے کہ دشمن سے مقابلہ کرنا اور شہید ہوجانا مشکل ہوکر بھی آسان تھا مگر اپنے چہیتوں، لاڈلوں اور دل کے ٹکڑوں کو رخصت کرنا اور ان کو خون میں ڈوبا ہوا دیکھنا ان کی لاشوں کا اٹھانا۔ اکبرؑ کے کلیجہ سے اور اصغرؑ کے گلے سے نیزہ اور تیر کا نکالنا کہیں زیادہ مشکل کام تھا۔ ایسے میں خون جگر پینا۔ صبر کرنا۔ اپنی شہادت سے سخت امتحان تھا۔

اسی اصول پر معرکۂ شہادت میں کام آجانے والوں سے زیادہ سخت امتحان تھا۔اسیران اہلبیت علیہم السلام کا جنہوں نے زخم زبان برداشت کئے اور روحانی اذیتوں کی سخت منزل سے گذرے۔

جناب ابراہیمؑ کی قربانی کی اہمیت بھی ختم ہوجاتی اگر اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری پھرنا ہوتی۔اصل قربانی اپنے ہاتھ سے اپنے اکلوتے فرزند کو ذبح کرنا اور صبر کرنا تھا۔

امام حسن علیہ السلام نے صلح کرنے کے بعد نادان دوستوں اور سفاک دشمنوں کے ہاتھوں جو اذیتیں برداشت کی ہیں اور جس طرح ان حالات پر صبر فرمایا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔

سوچئے ہادی اعظم کو (معاذ اللہ) ہذیان کا الزام دیا جائے اور کل ایمان علیؑ کو (معاذ اللہ) کافر کہا جائے اور امام حسن علیہ السلام کو (معاذ اللہ) مذل المومنین (اے مومنین کو ذلیل کردینے والے) کہہ کر سلام کہا جائے اور یہ حضرات صبر کریں۔آج صدیوں کے بعد سننے والے بے چین ہوجاتے ہیں تو صاحب معاملہ پر کیا گذری ہوگی۔ اس سلسلہ میں اتنا اور یاد رکھنا ہوگا کہ حضورؐ کو مرض الموت میں الزام دیا گیا کہ امیر المومنین علیہ السلام کو زندگی کے آخری دور میں الزام دیا تھا اور امام حسن علیہ السلام کو آپ کے دس سالہ عہد امامت کے پہلے سال یہ الزام دیا گیا اور آج تک الزام دیا جاتا ہے۔آپ نے اسی صبر میں عمر گذاری۔زہر کی تکلیف عظیم ہوکر بہت کم تھی اس زہر کے مقابلہ میں جو دس سال تک ماحول میں گھلا رہا اور امام اسی میں نہ صرف سانس لیتے رہے بلکہ ہادیانہ فرائض انجام دیتے رہے۔پھر ان مصائب پر شکر بھی ادا فرماتے رہے۔امام حسن علیہ السلام کی زندگی دین کے دونوں اجزا صبر و شکر کی مکمل تفسیر ہے۔امام اپنا کام کر گئے اب ہمارا فریضہ

ہے کہ نعمت و مصیبت میں خدا کی اطاعت کریں اور اپنے کو گناہوں سے بچائیں۔چاہے دماغ کو ایسی جراحتیں پہنچیں کہ دل کے سارے تار جھنجھنا اٹھیں مگر ہم ہر حال میں اپنے جذبات پر قابو رکھیں۔اور خدا و نبیؐ و امامؑ کے احکام کے مطیع رہیں اور نافرمانی سے بچتے رہیں۔مگر ہم میں کئی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ ہیں جو نعمتوں میں خوشیوں میں تو احکام ماننے پر اس کا شکر ادا کرنے پر خوش رہتے ہیں۔لیکن اگر نعمت مصیبت سے اور خوشی غم سے بدل جائے تو وہ بھی خدا کے لیے بدل جاتے ہیں اور اس قدر بد دل ہوجاتے ہیں کہ پھر حکم خدا ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مصیبت میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔نماز عبادت صدقہ خیرات، ترک گناہ وغیرہ میں اضافہ کرتے ہیں تاکہ مصیبت ٹل جائے اور مصیبت ٹل جانے کے بعد پھر وہ خدا کو بھول جاتے ہیں۔عبادت چھوڑ دیتے ہیں۔گناہوں میں مشغول ہوجاتے ہیں خیر۔خیرات کے لیے تنگ دل اور غریب مومن کے لیے سنگ دل ہوجاتے ہیں۔

تیسری قسم سب سے بدتر ہے کہ وہ نعمت میں فرعون بن جاتے ہیں اور مصیبت میں معاذ اللہ خدا تک کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔کسی حال میں ہوں مگر نافرمان کے نافرمان رہتے ہیں۔البتہ کچھ وہ لوگ بھی ہیں جن کو اپنے ائمہ کی زندگی یاد رہتی ہے وہ مصیبت میں صبر کرتے ہیں۔نعمت پر شکر کرتے ہیں اور وہ تو لعل شب چراغ ہیں جو مصیبت پر شکر کرتے ہیں۔

صلح حسنؑ کو سیاق وسباق تاریخ سے ملا کر سمجھئے

اگر جملہ کو سیاق وسباق سے الگ کر کے پڑھائے تو ہمیشہ مفہوم غلط ہو جائے گا۔ لاتقربو الصلوٰۃ۔ (نماز کے قریب نہ جاؤ) اس قرآنی فقرہ کا یہی مطلب قرار دیا جائے گا کہ نماز پڑھنا حرام ہے۔ گناہ ہے۔ حالانکہ یہ جملہ کو سیاق وسباق سے الگ کرنے کا گناہ ہے کیونکہ اس فقرہ کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی ہے کہ وانتم سکاریٰ یعنی جبکہ تم نشہ میں ہو۔

خدا نے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے نہ کہ نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ لیکن سیانے، چالاک، عیار، مناظرہ باز، جاہل عوام کو دھوکہ دیتے ہیں کہ خدا نے قرآن مجید میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ اور چونکہ عوام قرآن سے ناواقف ہیں لہٰذا کچھ لوگ اس کی بات صحیح مان لیتے ہیں اور کچھ لوگ تذبذب ہو جاتے ہیں کہ مانیں یا نہ مانیں۔ اور کچھ لوگ دہشت زدہ ہو جاتے ہیں کہ ظالم نے قرآن مجید کی آیت نکال دی ہے اور ساری دنیا کے مسلمان نماز کو واجب ولازم وضروری قرار دے رہے ہیں۔ ہائے اب کیا کریں۔

یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو کسی امامؑ اور معصومؑ کی زندگی کو تنہا، سلسلہ

امامت وہدایت سے الگ کر کے پڑھتے ہیں۔ حالانکہ ہر امامؑ ومعصومؑ کی زندگی ایک سلسلہ ہدایت کی کڑی ہے جو نہ ہدایت کی تاریخ کے ماضی اور مقابل سے الگ ہو سکتی ہے اور نہ اپنی تاریخ کے مستقبل اور مابعد سے الگ ہو سکتی ہے۔ امام حسنؑ وامام حسینؑ دو الگ شخصیتیں نہیں ہیں۔ جن کی زندگی ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہو کہ یہ سوچا جائے کہ ایک نے جہاد کیا اور جان دیدی۔ دوسرے پر معاذ اللہ جان چرائی اور صلح کر لی۔ ایک کو بہادری کی سند دیدی جائے اور دوسرے پر معاذ اللہ بزدلی کی تہمت لگا دی جائے۔ بلکہ دونوں امامؑ ایک سلسلہ ہدایت کی کڑی ہیں دونوں نے اپنے اپنے عہد میں حالات کے پیش نظر اسلام کی حفاظت کی ہے اور دین کی تبلیغ کی ہے۔ یہی نہیں کہ دو اماموں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پڑھنے والے ان کے بارے میں تضاد کردار کے شبہ میں پڑ جاتے ہیں بلکہ ایک ہی زندگی کو اگر مقصد زندگی متعین کئے بغیر پڑھا جاتا ہے تو اسی ایک زندگی میں تضاد کردار نظر آنے لگتا ہے۔ رواجی معترض تو یہی کہتا ہے کہ جب امام حسن علیہ السلام نے صلح کی تو امام حسین علیہ السلام نے صلح کیوں نہیں کی اور اگر امام حسن علیہ السلام نے جہاد کیا تو امام حسن علیہ السلام نے جہاد کیوں نہ کیا۔ دونوں نے امامؑ ہو کر الگ الگ اقدام کیوں کیا۔ لیکن سیاق وسباق سیرت سے بے خبر شخص تو حضور پر معترض ہو جاتا ہے کہ مکہ کا صابر رسولؐ مدینہ کا جنگجو رسولؐ کیوں بن گیا۔ صبر کیا تھا تو دونوں جگہ صبر کرتے لڑے تھے تو دونوں جگہ لڑتے۔ بلکہ مولیٰ علیؑ کی زندگی میں تو معترض کوئی اتار چڑھاؤ نظر آتے ہیں۔ عہد رسولؐ میں جہاد کرنے والا علیؑ حتیٰ کہ مکہ میں معالم کمسنی نبیؐ کو اذیت دینے والے بدتہذیب بچوں کی پتھروں سے دل کھول کر مرمت کرنے والا علیؑ بعد وفات رسولؐ بالکل صبر اور خاموش ہو جاتا ہے۔ اور پھر ۲۵/سالہ خاموشی کے بعد وہ بھی شباب

کے گذر جانے کے بعد۔ پیری میں یہی علیؑ جمل وصفین ونہروان میں شمشیر زن وصف شکن نظر آتے ہیں معترض کو بار بار اعتراض کی جگہ نظر آتی ہے۔لڑتے تھے تو نبیؐ کے بعد گھر کیوں بیٹھ گئے۔گھر بیٹھ گئے تھے تو دوبارہ کیوں میدان میں اترے۔

مختصر یہ کہ مقصد متعین کئے بغیر کسی کے حالات زندگی پڑھنے اور حالات کے سیاق وسباق نہ سمجھنے کے نتیجہ میں ایسی ہی مشکلیں پیدا ہوتی ہیں جن سے دو چار ذہن نہ صرف معترض بن جاتا ہے بلکہ مشکوک ومنکر بھی بن جاتا ہے۔سلسلہ اعتراض وشکوک وانکار خدا تک پہنچتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کو لاکھوں ٹن آگ میں خدا بچالیتا ہے۔اور جناب موسیٰ کا ہاتھ اور زبان دونوں فقط ایک انگارے سے جل جاتے ہیں۔آگ ایک ہے۔خدا ایک ہے۔دونوں اسی خدا کے نبیؐ ہیں مگر ایک جل جاتا ہے اور ایک بچ جاتا ہے۔معترض منھ کھولتا ہے کہ ایک خدا کے دوہرے کردار کیوں ہیں۔حالانکہ اگر مقصد معین کیا جائے اور واقعات کو مقصد سے مربوط کرکے دیکھا جائے تو نہ صرف اعتراض ختم ہوجاتے ہیں بلکہ جو کردار پہلے قابل اعتراض نظر آتے ہیں وہ شاہکار نظر آنے لگتے ہیں۔

اب اعتراض کے حل سنئے۔اللہ کو جناب ابراہیمؑ کو بھی بچانا تھا اور جناب موسیٰ کو بھی۔جناب ابراہیمؑ اسی وقت بچ سکتے تھے جب آگ گلزار ہوجائے۔لیکن اگر انگارہ جناب موسیٰؑ کے ہاتھ پر ٹھنڈا ہوجاتا اور نہ جلاتا تو فرعون کو یقین ہوجاتا کہ جناب موسیٰ وہی غیر معمولی بچہ ہیں جو اس کی حکومت کو ختم کریں گے۔لہٰذا قتل کردیتا۔حفاظت اسی میں تھی کہ ہاتھ جل جائے تاکہ فرعون مطمئن ہوجائے اور موسیٰ کی پرورش فرعون کے گھر ہوتی رہے یعنی فرعون شکن فرعون ہی کے گھر پلتا رہے۔

اسی طرح مکہ میں حضرتؐ نے جہاد نہیں فرمایا کیونکہ طاقت جہاد نہ تھی۔

بصورت جہاد حضورؐ اور آپ کے ساتھ مسلمان واسلام سب شہید ہوجاتے۔لیکن جب اسلام میں طاقت جہاد پیدا ہوگئی اور دشمن نے پھر بھی طاقت کے ذریعہ اسلام اور مسلمان کو مٹانا چاہا تو حضورؐ نے جنگ کرکے بتایا۔ہم مذہب اور دباؤ کو دو الگ الگ چیزیں مانتے ہیں نہ دباؤ ڈالتے ہیں نہ دباؤ مانتے ہیں۔

حضرت علیؑ بھی عہد رسولؐ میں جہاد کرتے رہے کہ ہم دباؤ نہیں مانتے ہیں۔ لیکن جب آپ کو آپ کے حق حکومت سے محروم کردیا گیا تو آپ نے خاموشی اختیار کی کہ ہم دباؤ نہیں ڈالتے ہیں۔لیکن جب عوام نے اپنی خوشی اور مرضی سے آپ کے حق حکومت کو مان لیا اور آپ نے حکومت سے ہدایت کا کام لینا شروع کردیا تو دشمن نے طاقت کے ذریعہ حکومت وہدایت کو روکنا چاہا تب جناب امیرؑ نے جنگ کرکے بتلایا ہم دباؤ مانتے بھی نہیں ہیں۔

باپ اور نانا کی سیرت دونوں شاہزادوں میں تقسیم ہوگئی۔بعد شہادت جناب امیر دونوں بھائیوں نے جہاد کیا۔مگر جب اسلام اور مسلمان دونوں کے کٹ مرنے کی نوبت آگئی تو دونوں بھائیوں نے صلح کرلی بلکہ امام حسینؑ تو کربلا تک صلح کے خواہش مند رہے مگر جب آپ سے صلح کے بجائے بیعت کا مطالبہ ہوا تو جہاد فرمایا اور شہادت قبول فرمائی یعنی پوری تاریخ ایک اصول کے گرد گردش کررہی ہے جب مرض بدلتا ہے تو دوا بدلتی ہے جب گمراہی نیا رخ اختیار کرتی ہے تو ہدایت نیا طریقہ کار اختیار کرتی ہے طریقہ کار کے فرق کا سبب حالات کا فرق ہے مگر مقصد ایک ہے۔

مکہ سے کربلا تک کا تاریخی خلاصہ یہ ہے کہ دشمن نے پہلے اسلام اور رسولؐ کے خلاف سرد جنگ کا آغاز کیا۔افواہیں پھیلائیں۔بائیکاٹ کیا۔تو رسولؐ نے بھی غیر مسلح

مقابلہ کیا۔لیکن شبِ ہجرت دشمن نے مسلح اقدام کر کے اپنی تیرہ سالہ سرد جنگ کی ناکامی کا اعتراف کیا۔اور گرم جنگ کا آغاز کیا۔مگر فتح مکہ کے دن دشمن نے کلمہ پڑھ کر اقرار کرلیا کہ رسولؐ سے نہ سرد نہ گرم کسی جنگ میں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا مگر دشمن اس غلط فہمی کا شکار ہوا کہ رسولؐ کے بعد کامیابی حاصل کرنا ممکن ہو سکے گا لیکن دشمن کو معلوم نہ تھا کہ علیؑ کی شکل میں ایک دوسرا محمد موجود ہے چنانچہ پچیس سال کی سرد جنگ میں دشمن کی ناکامی اس وقت ظاہر ہوگئی جب علیؑ کے پاس حکومت خود چل کر آ گئی۔لہٰذا دشمن نے گرم جنگ کا آغاز کیا۔مگر فتح علیؑ کے مقدر میں رہی اور شکست باطل اور دشمن کے مقدر میں رہتی البتہ علیؑ کی شہادت کے بعد تجربہ کار دشمن کی نگاہ نے محسوس کرلیا کہ حسنؑ اپنے وقت کے علیؑ بھی ہیں اور محمد بھی ہیں۔

لہٰذا نہ سرد جنگ مناسب ہے نہ گرم جنگ مفید ہے۔لہٰذا صلح کا نیا حربہ آزمایا گیا لیکن اگر صلح کے شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی امامت کے مضر ہوتی اور حکومت کے لیے مفید ہوتی تو دشمن اس شرط بھی امامت کے لیے مضر ہوتی اور حکومت کے لیے مفید ہوتی تو دشمن اس شرط صلح پر ضرور عمل کرتا۔مگر ہر شرط صلح کے خلاف ورزی کا مطلب ہے کہ صلح نامہ مکمل طور پر امامت کے لیے مفید اور حکومت کے لیے مضر تھا۔اس کا دوسرا ثبوت یہ بھی ہے امام حسین علیہ السلام بعد امام حسنؑ شرائط صلح پر باقی رہے اور یزید کو بھی دعوت صلح دی لیکن یزید صلح پر راضی نہ ہوا۔جو اس بات کا اقرار تھا کہ صلح حکومت کے لیے مضر تھی اور مضر ہے اور صلح امامت کے لیے مفید تھی اور مفید ہے۔

صلح کے فتوحات بہت ہیں مثلاً کبھی علیؑ کے سامنے قرآن وسنت رسولؐ کے ساتھ اضافہ، سیرت کا مطالبہ کیا جا رہا تھا مگر صلح میں صرف قرآن وسنت کا ذکر تھا کسی کی

سیرت کا ذکر نہ تھا۔یہ کتنی عظیم کامیابی تھی جو صلح سے حاصل ہوئی۔

یہ بھی ایک عظیم کامیابی ہے کہ سواد اعظم نے طے کرلیا کہ امام حسن علیہ السلام کی چھ ماہ کی حکومت پر خلافت کا خاتمہ ہوگیا آپ کے بعد صرف نوچ کھسوٹ والی حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔صلح میں دشمن کی ناکامی کا یہ ثبوت بھی ہے کہ صلح کرنے والا زہر دے کر امام حسن علیہ السلام کو شہید کرا کے اقرار کرتا ہے ان سے صلح غلط کی تھی۔ان کی زندگی میں بہرحال کامیابی نہ ہوگی چاہے صلح ہو یا جنگ۔لیکن قتل بھی عظیم غلطی تھی کیونکہ فرد کا قتل ممکن تھا سلسلہ ہدایت کا قتل ممکن نہ تھا۔اور حسنؑ کے بھائی حسینؑ، محمدؐ و علیؑ و حسنؑ کے روپ میں موجود تھا۔یزید بدنام زمانہ ہوگیا مگر صرف حسینؑ قتل ہو سکے۔سلسلہ ہدایت باقی رہا۔اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے جس کا کل ظہور ہوگا اور پوری دنیا کو مسلمان بنا کر عہد حضورؐ سے شروع ہونے والی سرد و گرم کش مکش کا خاتمہ کر دے گا۔غرضکہ حضورؐ سے حضرتؑ تک ایک سلسلہ ہے جس کی ایک کڑی کا نام امام حسن علیہ السلام ہے ان کو سیاق وسباق تاریخ ہدایت سے الگ کر کے پڑھنے کی غلطی نہ کی جائے تو صلح حسنؑ شاہکار نظر آئے گی۔

اسباب شہادت

۲۰؍سال ایک مدت ہوتی ہے۔کبھی اس مدت کوایک قرن کہاجا تا تھا۔اب یہ مدت ایک عمر کے برابر ہوگئی ہے۔ ۱۹۶۱ء کے مارچ کے مہینہ میں خداوندعالم نے سالہاسال کی تڑپ کے بعدعراق کی زیارتوں سے مشرف کیا۔عراق کے بعد ایران گئے۔عتبات عالیات کی زیارتوں کے علاوہ آقائے محسن حکیم طاب ثراہ اورمفکر مشرق۔ عالمی اسلامی انقلاب کے محرک آقائے باقر صدر طاب ثراہ کی ملاقاتوں کا شرف بھی حاصل ہوا۔ پھر۲۰؍سال تک زیارتوں سے محروم رہے۔حتیٰ کہ عراق کا ویزہ ملنا بھی نا قابل تصورہوگیا۔

مگر رحمت کب رخ کرے گی۔کسی کونہیں معلوم۔ایک دوست کے اصرار پرمع اہلیہ ممباسا(کینیا۔افریقہ) ماہ رمضان بسر کرنے گیا۔کینیا سے عراق کا ویزہ مل گیا۔ عراق،کینیا کی دوستی مشہور ہے۔مولانا سیدعلی عابدصاحب قبلہ رضوی کراروی جوعرصہ سے نیروبی میں مقیم ہیں۔ان کی قیادت میں ہم لوگ روانہ ہوئے۔ بغداد ایئرپورٹ پر اترے ۱۶؍ساتھیوں میں ۱۳پاس ہوگئے۔چودھویں مولانا علی عابدصاحب قبلہ تھے۔جن کے سر پرعمامہ اورکاندھے پرردا تھی۔آپ روک لئے گئے۔ایک لمبے چوڑے رجسٹر کی ورق گردانی ہوئی سیدعلی عابدالرضوی ہرلفظ کے ذریعہ چھان بین ہوئی۔مکمل تحقیق کے بعدامیگریشن نے مہرلگائی۔مولانا کے بعدہم میاں بیوی کے پاسپورٹ پربھی فوراً مہر

لگ گئی۔اس واقعہ نے محسوس کرادیا کہ ہم کس عراق میں داخل ہورہے ہیں۔کسٹم میں سب پاس کردیا گیا۔دوفارسی زبان کی کتابیں روک لی گئیں۔عراق علم وعلماء کا کتنا دشمن ہے۔یہ تاثیر لے کرہم کاظمین پہنچے۔قافلہ میں ۱۶؍میں سے۱۳؍حضرات خوجہ تھے۔ہم سب نے خوجہ مسافرخانہ کا رخ کیا۔مولانا علی عابدصاحب بہت مرتبہ اس میں ٹھہر چکے تھے مگر آج اعلان تھا کہ صرف خوجہ ٹھہر سکتے ہیں۔سیدنہیں۔اگرمولانا میری طرح شیروانی ٹوپی میں ہوتے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔مسافرخانہ کے منتظم عالم دین کوٹھہرا کر اپنے سرعذاب مول لینے پر تیار نہ تھے ہم ہوٹل میں جگہ تلاش کرنے نکلے۔ہمارا سامان باہر کردیا گیا۔ہماری بیوی کونماز قضا ہونے کے خطرہ کے باوجود نہ وضوکی اجازت تھی نہ نماز کی۔یہ تھا دین دشمن عراق۔

ہم جس ہوٹل میں گئے۔مولانا کودیکھ کر ہرجگہ انکار ہوتا رہا۔آخر میں جگہ ملی کیونکہ میں اکیلا جگہ لینے گیا۔ذہن بوجھل ہوچکے تھے۔ملعون صدام کی تصویریں حرم میں بےشمار لگی تھیں۔ملعون کی ظالمانہ مسکراہٹ دیکھ دیکھ کرخون کھولتا تھا۔مگر کیا کرتے۔حرم میں داخل ہوئے۔معلوم ہوا حرم بندہوگیا ہے۔رواق میں زیارت پڑھی۔خوفزدہ ماحول ہرجگہ طاری دیکھا۔صدام کی مکروہ شیطانی،قاتل،سفاک مسکراہٹوں والی تصویروں سے نظر بچانا ممکن نہ تھا۔ ہرسڑک، ہرمکان، ہرچوراہا، ہردوکان پربس صدام ملعون کی تصویریں آویزاں تھیں۔اس کی تصویر پرنظر پڑتے ہی مظلوم باقر صدر کی تصویر نظروں میں گھوم جاتی تھی۔

ہندوستان کے آزادشہری نے آج زندگی میں پہلی بارظلم کے ماحول میں گھٹی سانس لی تھی۔کاظمین سے نجف پہنچے۔نجف ویران، مدرسے خالی،علماء مفقود،طلاب

ناپید، حرم اداس، یہاں بھی جگہ لینا ایک کام تھا۔مگر نیروبی کے مومنین کام آ گئے۔جگہ مل گئی، کیونکہ عراق میں روپیہ ہی سب کچھ تھا۔ ہمارے ذہنی خوف اور طبیعت کی اداسی میں اضافہ ہوتا گیا۔صرف آقائے خوئی مدظلہ ملے۔مسجد خضر میں نماز پڑھاتے تھے۔مسجد ۳۰x۶۰ فٹ کی ہوگی مگر مغربین میں بھی بھرتی نہ تھی۔

آقائے شیخ محمد تقی آل رضی ملے۔مگر کسی سے کچھ معلوم کرنا بڑی بات، بات کرنا بھی مناسب نہ تھا۔۲۰ر سال قبل آقائے خوئی کے یہاں باقر صدرؒ شہید ملے تھے۔آج ان کے مکان کی طرف سے گذر در کنار دیکھنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔مکان میں کوئی تھا بھی نہیں۔مکیں کو آگ، شکنجہ کی اذیت دے کر خنجر سے شہید کیا جا چکا تھا۔بہن بھی بھائی کے ساتھ شہید ہو چکی تھی۔فوجی گاڑی میں لاشیں لا کر وادی السلام (قبرستان نجف) میں رات کے اندھیرے میں دفن کر دی گئی تھیں۔قبروں کا نشان بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔عمامہ وعبا لاشوں کو دفنانے کے بعد آقائے خوئی کے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔یہ باپ کو بیٹے کی سنائی سنائی گئی تھی۔اور دھمکی بھی تھی۔آقائے خوئی نے اپنی تکلیف شرعی یہی معین کی تھی کہ وہ ہر حال میں عراق میں رہیں۔کل کربلا میں باپ شہید ہوا تھا۔بیٹا بعد کے امور کے لیے زندہ رہا تھا۔آج نجف میں بیٹا شہید ہوا تھا۔اور قافلہ اسلام کو عراق میں سنبھالنا باپ کے ذمہ تھا۔شہید خامس کی بیوہ اپنے یتیم اور یتیمہ کو لے کر شہید کے بھتیجے کے پاس کاظمین میں مقیم تھیں۔بیوہ کا بھائی موسیٰ صدر پہلے شہید ہو چکا تھا۔شوہر اب شہید ہوا تھا۔مگر بیوہ ایک ننھے باقر الصدر اور ایک کمسن بنت الہدیٰ کی پرورش میں مشغول تھی۔ انشاء اللہ تعالیٰ دنیا کل پھر دوسرے باقر صدر اور بنت الہدیٰ کو دیکھے گی۔خوف وہراس کے باوجود حالات معلوم ہوتے گئے۔

فیصل کے قتل کے بعد عراق میں بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوگی۔بعث پارٹی کا مذہب کمیونزم تھا اس پارٹی کا موجد ایک غیر مسلم یہودی یا عیسائی تھا۔عراق کی حکومت روس کی ماتحت حکومت تھی۔آقائے حکیم نے کھل کر فتویٰ دیا کہ کمیونزم کفر والحاد ہے۔اس میں شرکت حرام ہے۔

فتویٰ نے عراق کو ہلا دیا۔لاکھوں آدمیوں نے توبہ کی۔آقائے حکیم نے سفر کرنا چاہا تو عراقیوں نے آپ کو مع آپ کی کار کے کاندھوں پر اٹھالیا۔حکومت لرز گئی۔ عبدالکریم قاسم نے بار ہا ملاقات کی کوشش کی۔مگر علم نے دولت کو حاضری کی اجازت نہیں دی۔یہی وہ جگہ ہے جہاں سے علماء اور حکومت کے درمیان تصادم شروع ہوا۔بعثی حکومت نے روسی پیسے سے سڑکیں بنوائیں۔اونٹ اور خچر کے بجائے ٹرک اور کاریں فراہم کیں۔اسکول کھولے تاکہ عراق کو ملحد بنایا جائے۔

آقائے حکیم نے گاؤں گاؤں لائبریریاں قائم کیں۔مدرسے کھولے پیش نماز رکھے۔اور ابتدائی مذہبی تعلیم کو ہر عراقی تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا۔اور اس مہم کا انچارج ۳۴ر سالہ باقر صدر کو مقرر کیا۔علماء اور حکومت کا فاصلہ بڑھتا گیا۔عراق اپنے تاریخی کردار سے مظاہرہ کی طرف بڑھتا گیا۔آقائے حکیم سے بے وفائیاں شروع ہوگئیں۔ مہدی حکیم کو روپوش ہو کر عراق سے نکلنا پڑا۔تب ان کی جان بچی۔جاسوسی کے الزام پر مومنین کو پھانسیاں شروع ہوگئیں۔اعلم کے ذرائع آمدنی کے سارے راستے روکنے کی مہم شروع ہوئی۔غیر ملکی نام پر ہر عالم اور طالب علم کو عراق چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔جنہوں نے انکار کیا ان کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔آقائے حکیم نے اس وقت انتقال کیا جب دین اور علم دین کے چراغ ایک کے بعد ایک بجھتے جا رہے تھے اور ظلم، استبداد، الحاد

وکفر کے بادل عراق پر چھا چکے تھے۔ جس میں حکومت کی بجلی کی چمک اور کڑک برابر بڑھتی جارہی تھی۔ اعاظم علماء انتقال کر چکے تھے۔ ان کے بعد کی صف کے علماء چھوڑ چکے تھے۔ آقائے خوئی پوری طرح بے بس تھے۔ صرف شہید خامس باقر صدر تھے۔ جن کو نہ غیر ملکی کہنا ممکن تھا۔ نہ ان پر ہاتھ ڈالا جاسکتا تھا۔ باقر صدر آقائے حکیم کے خطوط پر آگے بڑھ رہے تھے۔

مدارس کے سلسلوں کے علاوہ حزب الدعوۃ نام کی جماعت قائم کر چکے تھے۔ بعثی حکومت کے لیے باقر صدر موت وزیست کا مسئلہ بن چکے تھے۔ مکار سیاست شروع ہوئی۔ اکادکا لوگ شہید کئے جانے لگے۔ دہشت پھیلانے کی مہم زور شور پر چلی۔ حزب الدعوۃ کے بارہ ہزار نمایاں، تجربہ کار باثر اور مخلص کارکن قتل کردیئے گئے۔ باقر صدر کے چارسو شاگرد شہید کردیئے گئے۔ باقر صدر خانہ قید کردیئے گئے سب طرف سے اطمینان کے بعد باقر صدر کو بغداد پہنچایا گیا۔ نجف ٹینکوں سے بھرا تھا۔ شہید خامس چلے گئے۔ نجف خاموش رہے۔ مگر معصومہ کونین کی کنیز باقر صدر کی بہن، بھائی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے اکیلی حرم امیر المومنین میں چادر اوڑھ کر آگئیں۔ تقریر کی، عورتیں گھروں سے نکل پڑیں۔ نجف کبھی کے مدینہ کی طرح عورتوں سے بھر گیا۔ اور بعثی حکومت نے اپنے پیش رو حکومتوں کی طرح خوفزدہ ہوکر باقر صدرؒ کو چھوڑ دیا۔ اور فاطمہ کی کنیز نے اپنی شاہزادی کی روش اپنا کر اپنے بھائی کو چھڑا لیا۔

باقر صدر واپس آگئے۔ مگر حکومت کو باقر صدر کے علاوہ بنت الہدیٰ کی شخصیت واہمیت کا بھی احساس ہوگیا۔ دس ماہ کی مسلسل نظر بندی کے بعد ایک رات کو بھائی بہن گرفتار کرکے لے جائے گئے۔ اور پھر ان کی لاشیں واپس آئیں۔

ان واقعات کے علم کے بعد شہید خامس کی شہادت کے اسباب واضح ہو چکے تھے کہ یہ لڑائی کفر والحاد اور اسلام کے درمیان تھی۔ اسی محاذ پر ایران میں آقائے خمینیؒ جنگ کر رہے تھے۔ اور عراق میں آقائے باقر صدرؒ اسی محاذ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ ان حالات کے علم میں آجانے کے بعد یہ گتھی بھی جل گئی کہ امریکہ نواز ایران کی حمایت میں روس نواز عراق نے آقائے خمینی کو عراق چھوڑنے پر کیوں مجبور کیا تھا امریکہ اور روس میں لاکھوں فاصلے ہوں۔ مگر دونوں اسلام کی مخالفت میں ایک دوسرے سے بالکل قریب تھے۔ قریب ہیں۔ قریب رہیں گے۔ اور انشاءاللہ ایک ساتھ دونوں ایک ہی قبر میں دفن ہوں گے۔

۸؍ستمبر ۸۰ء کو بغداد چھوڑا۔ ۱۶؍دن کے قیام میں حالات معلوم ہو چکے تھے۔ ۱۶؍دن میں دل و دماغ خود بخود مفلوج ہو چکے تھے۔ پورے عراق میں ایک ہی نعرہ تھا ہم عرب ہیں، ہم عرب ہیں۔ مسلمان ہونے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ بلکہ رسول اسلام کو بھی صرف ایک عرب کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔

کافر عراق سے نکلے۔ ۹؍ستمبر ۸۰ء کو تہران پہنچے۔ ۱۹؍ستمبر کو تہران چھوڑا۔ ۲۱؍ستمبر کو اعلان جنگ ہوگیا۔ جھڑپیں پہلے ہی سے جاری تھیں۔ ۲۰؍سال پہلے جس ایران میں آئے تھے وہاں مذہبیت صرف یہ دیکھی تھی کہ ہر ٹرک پر امام رضا علیہ السلام کا مفروضہ فوٹو لگا کر امامؑ کی توہین بنام محبت کی جارہی تھی۔ حرم کے علاوہ پورا ایران نہ صرف مذہب سے آزاد تھا بلکہ مذہب دشمن راستہ پر جارہا تھا۔ جا نہیں رہا تھا۔ بلکہ حکومت لے جارہی تھی۔ پہلوی کافر حکومت سے علماء ٹکر لیتے رہے تھے۔ لیکن مدرسہ فیضیہ کا ٹکراؤ تاریخی بن گیا۔ اور اسی ٹکراؤ سے آقائے خمینی کی تاریخ ساز شخصیت ابھری۔ جس کے سہارے

اسلامی انقلاب آیا۔مگر یہ انقلاب بھی اس لئے آیا کہ ۳۰ر سال تک علماء جان پر کھیل کر ہر فرد تک مذہب پہنچا رہے تھے۔جس کے نتیجہ میں وہ نوجوان نسل پیدا ہوئی جو پاسدار انقلاب اسلامی بن گئی۔

عراق کی تباہی جو آقائے خوئی کی بے بسی اور شہید خامس آقائے باقر صدر کی شہادت تک پہنچی اور ایران کی ترقی اسلامی انقلاب تک پہنچی۔ وہ اسلامی انقلاب جس کے داخلی وخارجی استحکام کو عراق کے حملہ اور بنی صدر ومجاہدین خلق کی بغاوت سے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ان دونوں باتوں کا سلسلہ صرف ایک بات تک جاتا ہے کہ ہر فرد شیعہ کو مذہبی تعلیم ملی یا نہیں۔ ہر فرد شیعہ پابند دین ہو گیا یا نہیں۔وہ اپنے کو آزاد سمجھتا ہے یا پابند احکام خدا سمجھتا ہے۔

عراق وایران کی واپسی پر خدا کا شکر کیا کہ اس نے ۱۲ر سال قبل ہم کو اور ہمارے ساتھیوں کو تنظیم المکاتب کے ذریعہ اس بنیادی خدمت کی توفیق ادا کر دی تھی شیعہ کا شیعہ نہ ہونا باقر صدرؒ کی شہادت کا سبب ہے۔اور آقائے خمینیؒ کی کامیابی کا سبب شیعہ کا شیعہ ہونا ہے۔

پہلے ہم اپنی زندگی میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم شیعہ ہیں یا نہیں اور اس کے بعد آقائے خمینیؒ کو مبارک باد دیں اور شہید خامس کو سلام کریں۔

بنت الہدیٰ کی شہادت عورتوں کو خصوصی طور پر اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی دعوت دے رہی ہے۔

درجن بھر حکومتوں کو شکست دینے والے امام صادقؑ

انسان جب کچھ بنانا شروع کرتا ہے تو اس کا نقش اول، اس کے ہاتھوں بننے والی پہلی تخلیق سب سے زیادہ ناقص ہوتی ہے کیونکہ اس کے علم کا ذریعہ تجربہ ہے جیسے جیسے تجربہ بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی تخلیق میں کمال اور خوبی کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف خداوند عالم خالق علم وعقل انسانی ہے۔اس کی ذات میں علم وکمال ہے اور علم وکمال اس کے عین ذات ہیں۔لہٰذا اس نے جس مخلوق کو سب سے پہلے پیدا کیا وہ سب سے زیادہ کامل سب سے زیادہ عالم اور ہر ممکن خوبی میں سب سے زیادہ اعلیٰ وارفع تھا۔ یہ اول مخلوق خدائے قادر وعالم کے کمالات کا آئینہ تھا۔اس اول مخلوق کا نام نور محمدؐ ہے۔آپ کے نور کے چودہ حصہ دار اور کمالات کے چودہ آئینہ دار خدا نے بنائے جو کمال میں یکساں تھے۔خود حضورؐ جناب معصومہ فاطمہ زہراؑ اور بارہ امامؑ اس نور کے ٹکڑے ہیں جن میں سے ہر ایک چودھویں کا چاند ہے۔عالم ظاہر میں ظاہر ہونے سے پہلے بھی یہ عالم نور میں علم وعصمت اور ہر فضیلت سے آراستہ وپیراستہ تھے اور جب اس دنیا میں پیدا ہوئے تو اپنے ساتھ علم وعرفان وعصمت وفضائل وکمالات لے کر پیدا ہوئے مگر افسوس کہ زمانہ نے ان کی ناقدری کی جو جاہل وگناہگار پیدا ہوئے اور جاہل وگناہگار رہے اور ان کا

مقابلہ پاکیزہ خصائل نبیؐ واہلبیتؑ سے کیا گیا جو پیدائش سے پہلے بھی عالم ومعصوم تھے اور پیدائش کے بعد بھی تاجدار علم وعصمت رہے بعض باتیں وہ ہیں جہاں عقل کا سپرانداختہ ہوجانا ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے۔ہم خدا کے وجود کواس کی قدرت وعلم وکمال کو عقل کے ذریعہ جان سکتے ہیں۔مخلوقات کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں مگراس کی حقیقت کو جاننے کی کوشش عقل کواسی طرح نابینا کردیتی ہے جس طرح سورج کو دیکھنے والا اندھا ہوجاتا ہے اسی طرح اول مخلوق نورمحمدیؐ کے چودہ حصہ داروں میں سے کسی کواپنی عقل کی سطح سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرنا انسان کونورایمان سے محروم کردیتا ہے اورانسان حیرت وشک وکندخیالی کا شکار ہوکرعقل وایمان کی دولت کھو بیٹھتا ہے۔

لہٰذا بعض دانشوروں کی یہ کوشش ایمانی تباہی کی کوشش ہے کہ یہ حضرات عالم نور میں کب پیدا ہوئے۔ کتنے دن کے بعد دنیا میں آئے۔ دنیا میں آنے سے پہلے ان کے کمالات کی حد کیا تھی۔ پھرانہوں نے عالم نور میں جلال وجمال الٰہی سے کیا کچھ جذب کیا اور کیا کیا حاصل کیا۔ پھر دنیا میں آئے تو کتنے کمالات کے مالک تھے۔ پھر اپنی شہادت کے بعد کیا کیا خدا سے اور پایا۔غرض کہ عالم نور سے عالم ظہور تک۔مہد سے لحد اورشہادت کے بعدان کی کمالات کی منزل کیا تھی یہ وہ منزل ہے جہاں عقل صرف حیرانی کا شکار ہوتی ہے۔بس قصہ مختصر یہ کہ یہ روز اول سے مالک کمالات تھے قادر خدا جو کچھ عطا کرسکتا ہے وہ اس نے ان کو دیدیا۔ اور بعد خدا سب سے برتر صاحبان کمال جتنا کچھ کمال لے سکتے تھے وہ انہوں نے حاصل کیا اور فیضان نور وجذب نور کا سلسلہ آج بھی بعدشہادت جاری ہے وہ کیا تھے انہوں نے کیا پایا ہم نہیں جان سکتے ہم کواس منزل میں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہم کیا ہیں جو ان کو ناپ تول کر جان سکیں اوریہیں پرعقل کوخدا کے

سامنے سجدہ ریز ہوجانا چاہئے کہ جب ہم اول مخلوق کی معرفت کاحق ادا کرنے سے عاجز ہیں توان کے خالق واحدواَحَد کی تفصیل یا اجمالی حقیقت کیا جان سکیں گے۔خدا کو بھی ہم نے ان چیزوں کے ذریعہ پہچانا جو اس نے ہم کو دی ہیں۔تو نبیؐ وآل نبیؐ کو بھی ہم صرف ان ہی نعمتوں کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں جوانہوں نے ہم کو دی ہیں۔مگر افسوس کہ ہم ان کی عطا کردہ نعمتوں کو جاننے ماننے اور پہچاننے سے غافل ہیں۔

۱۵رشوال ۱۲۸ھ کو ۶۵ سال کی عمر میں منصور خلیفہ عباسی کے زہر سے شہید ہونے والے امام جعفر صادق علیہ السلام جو جنت البقیع میں دفن ہوئے جن کے زمانہ میں دس بنی امیہ کے بادشاہ گذرے۔جن کے عہد میں بنی امیہ کی حکومت اپنے ہاتھوں اپنی موت تک پہنچی۔مظالم نے ظالموں کا خاتمہ کرایا۔ بنی عباس اقتدار میں آئے بنی عباس کا پہلا بادشاہ سفاح کے نام سے مشہور ہوا۔سفاح یعنی خونریزی کرنے والا۔اس کے بعد آپ کے سامنے منصور کوحکومت ملی۔جس نے آپ کوشہید کرکے دوزخ کی بدترین جگہ حاصل کی۔امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے ۱۲رحکومتیں قائم ہوئیں دور بنی امیہ ختم ہوا۔بنی عباس نے خون ناحق حسینؑ کے نعرہ کے ذریعہ بنی امیہ کومٹایا اوراپنے کو بنی امیہ کی جگہ پر بٹھایا۔مگر خون حسینؑ کے یہ سوداگر اپنے عہد کے یزید نکلے اور ہر عہد کے حسینؑ کو قتل کرتے رہے۔منصور کے ظالم دور میں جو حسینؑ شہید ہوا اس کا نام ہے امام جعفر صادق علیہ السلام آپ نے دین کے اصول وفروع کوعقل وحکومت کو جو سرمایہ دیا اس کو آج بھی شریعت ومذہب فقہ وفلسفہ، دین ودانش گلے سے لگائے ہے اوران کے ذریعہ مشکلات کو حل کرتی رہتی ہے۔اس علمی جعفری دین اورعطیہ بخشش کے علاوہ امام نے بتایا کہ سیاسی بازیگروں کی حدوانتہا ومعراج،اقتدار ہے۔لیکن امامت حکومت کوٹھکراتی ہے اور ہدایت

کو کلیجہ سے لگاتی ہے۔ زندگی یوں صرف تعلیم دین فرمائی کہ دین الٰہی و دین محمدی، دین جعفری بن کر زندگہ جاوید ہوگیا۔ اسی شوال کی ۸؍تاریخ کو آل سعود نے جنت البقیع کو منہدم کیا۔ جس کی ۱۵؍کو منصور نے امام جعفر صادقؑ کو شہید کیا تھا۔ مگر بنوامیہ سے بنوعباس تک اور بنوعباس سے آل سعود تک سب بے نشان اور بدنام ہیں۔ اور امام جعفر صادقؑ کا سلسلہ علم و مذہب میں آج بھی جاری ہے اور عہد ظہور میں سارے عالم پر حاوی ہوجائے گا۔ اگر ہم کو جعفری بننا ہے تو علم و عمل میں، عبادات و معاملات میں اپنے کو سچا ثابت کرنا ہوگا۔ مذہب کا صرف وہ وفادار ہے جو اس کے احکام کا پابند ہے ورنہ دین ہماری شکایت ہمارے آقاؤں سے کرے گا اور ہمارے پاس معذرت کے لئے زبان نہ ہوگی۔

وقت ظہور قریب ہے یارو

جو دن گذرتا ہے تین چیزیں ہم سے قریب ہوتی جاتی ہیں۔ موت، ظہور، قیامت، موت ہماری اس دنیاوی زندگی کا آخری انجام ہے۔ قیامت اس پوری دنیا کا آخری انجام ہے۔ اور ظہور حق و باطل کی کشمکش کا آخری انجام ہے۔ دین ہمیشہ مقہور و مغلوب و مجبور اور بے بس رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ ظالم کو ہمیشہ اینڈ نا، من مانی کرنا نراج پھیلانا نصیب نہ ہوگا۔ مظلوموں اور مومنوں کو ہمیشہ آہیں بھرنا، آنسو بہانا نہیں پڑیں گے۔ بلکہ قیامت سے پہلے ایک دن نہیں بلکہ ایک عہد ایسا آنے والا ہے جب مکمل طور پر غلبہ وقت و اختیار دین الٰہی کو حاصل ہوجائے گا۔ ظلم و گناہ اپنی ذلیل موت تک پہنچ جائیں گے۔ مسکراہٹ اور فاتحانہ مسکراہٹ کامیاب و کامران مظلوموں اور مومنوں کے لبوں پر ہوگی۔ سراسیمگی اور گھبراہٹ، ذلت و رسوائی ظالموں کا مقدر بنے گی۔ یہ دن اور یہ عہد آئے گا اور ضرور آئے گا۔ کب آئے گا کسی کو نہیں معلوم۔ اندازہ لگانا، وقت معین کرنا کسی کے لیے بھی جائز نہیں لیکن کتنی ہی دیر کیوں نہ ہوجائے یہ دن اور یہ عہد ضرور آنے والا ہے۔ بلکہ روز بروز یہ عہد قریب ہوتا جارہا ہے۔ بیتاب طبیعتیں انتظار نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ اور بے تمیز ذہن بجائے انتظار کے انکار کرنا چاہتے ہیں لیکن وقت کے دھارے کو کوئی موڑ نہیں سکتا۔ البتہ یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ہمیشہ سے ایمان و مومن، اسلام و مسلمان کیون غالب نہ رہے بلکہ شروع ہی سے کیوں نہ غالب ہوگئے جبکہ دین کا بھیجنے

والا خدا وہ ہے جو نہ کبھی مغلوب ہوا ہے نہ کبھی ہوگا تو بے شک خدا غالب تھا غالب ہے غالب رہے گا لیکن غالب خدا بھی حلم سے کام لیتا ہے کیونکہ دین و مذہب کی بنیاد ہے انسان کا اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ نیک بننا۔خدا نیک بننے میں مدد دیتا ہے۔ہادیوں کو بھیجتا ہے۔ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو عبرت وبصیرت کا سامان فراہم کریں لیکن اپنی طاقت کا ادنیٰ سا استعمال بھی انسان کو نیک بنانے میں نہیں کرنا چاہتا ورنہ انسان اپنے اختیار سے نیک نہیں بنے گا۔بس یہی خود اختیار نیکی کا حصول ہی وہ عظیم مقصد ہے جس کے لیے اشرف المخلوقات انسان پیدا ہوا اور انسانوں میں جتنے انسان اشرف تھے وہ سب کے سب اسی مقصد کے لیے اپنی اپنی عظیم زندگیاں بسر کر گئے۔نہ صرف زندگی بسر کر گئے بلکہ عظیم قربانیاں بھی دے گئے۔اسی عظیم مقصد کے تقدس کو برقرار رکھنے کے خدائے علیم وحکیم وعظیم نے کبھی مداخلت نہیں کی۔بلکہ ہدایت کے کام کو طبعی رفتار کے مطابق چلنے دیا۔ شیطان کی رکیک حرکات برداشت کیں۔فرعون ونمرود ویزید کے مذبوحانہ اقدامات برداشت کئے۔آدمؑ کے آنسوؤں سے لے کر حسینؑ کے خون تک کو بہنے دیا۔آج بھی امریکہ واسرائیل وروس وصدام بہشتیوں کا خون بہا رہے ہیں باہنر کو آگ میں جلا رہے ہیں۔لیکن خدا کی طاقتیں حلم سے کام لے رہی ہیں۔یہاں تک کہ ظلم تھک جائے۔باطل کی حیلہ سازی ختم ہوجائے انسان کی آنکھیں کھل جائیں۔اور سیاسی،سماجی،ثقافتی،صنعتی، زراعتی،سائنسی انقلابات کے ہاتھوں ہر طرح تھک جانے والی انسانیت کو طلوع صبح کا خود بخود انتظار شروع ہوجائے۔مادہ پرستی چور چور ہوجائے اور انسان ان دیکھی روحانیت کی طرف خود بخود کھینچنے لگے۔تو پھر جب صبح ظہور آئے گی۔اور شب غیبت ختم ہوگی،تو چوندھیایا ہوا انسان حق کی طرف عدل کی طرف روحانیت کی طرف۔دین کی

طرف اسلام کی طرف پورے شوق وذوق وعلم ومعرفت کے ساتھ لپکے گا۔اس وقت ہر ظالم کو اپنی موت نظر آنے لگے گی۔وہ نجات دہندہ انسانیت کو ختم کردینا چاہیں گے۔مگر آنے والا اپنے ساتھ جہاں مظلوموں کے لیے زندگی لائے گا وہاں ظالموں کے لیے موت بھی لائے گا۔ہر ظلم مٹ جائے گا صرف عدل کامل یعنی اسلام باقی رہ جائے گا۔

صبح ظہور انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہوجائیں گے ایک امامؑ سے مقابلہ کرنے والے،دوسرے امامؑ کا ساتھ دینے والے۔مقابلہ کرنے والوں کو کہیں امان اور پناہ نہ ملے گی وہ نفاق کے ذریعہ مدد کرنے والوں میں شامل ہوکر بھی پناہ نہ پاسکیں گے۔تطہیر کا عمل اور صفائی کی مہم اتنی تیز اور محیط وحاوی ہوگی کہ جو کوئی شخص جس کی عمر ۲۰/سال یا اس سے زیادہ ہوگی اگر وہ دین نہیں جانتا ہوگا۔دینی واقفیت نہ رکھتا ہوگا۔حلال وحرام، واجب وگناہ سے لاعلم ہوگا،احکام شریعت پر مکمل طور پر عامل نہ ہوگا تو ایسا ہر شخص امام کے حکم سے قتل کردیا جائے گا۔کسی جاہل کو عقیدہ کے نام پر پناہ نہ ملے گی کسی فاسق اور بے عمل کو اقرار دین کے نام پر امان نصیب نہ ہوگا۔

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ وقت ظہور قریب ہے کسی وقت بھی اعلان ظہور ہوسکتا ہے کیا ہم نے دینی واقفیت حاصل کرلی ہے۔کیا ہم نے واجبات کو ادا کرنے کی عادت ڈال لی ہے کیا ہم گناہوں سے باز رہنے کے عادی ہوچکے ہیں۔کیا ہم نے اپنے گناہگار ماضی کے لیے توبہ کرلی ہے کیا ہم نے اپنے حال ومستقبل کو ایسا پابند بنالیا ہے کہ ہماری توبہ قبول ہوسکے۔اگر ابھی ہم نے ایسی تیاری نہیں کی ہے تو وقت مہلت وفرصت کو ضائع کئے بغیر ہم کو ظہور کی تیاری کرلینی چاہئے۔ورنہ

وقت ظہور قریب ہے یارو

یہ سوچنا غلط ہوگا کہ ممکن ہے ہمارے سامنے ظہور نہ ہو۔ کیونکہ غیبت کے معنی یہ ہیں کہ ہم حضرت کو نہیں دیکھ رہے ہیں کہ حضرتؑ ہم کو نہیں دیکھ رہے ہیں غیبت پر ایمان رکھنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم کو ہمہ وقت یہ تصور رہے کہ خدا نبیؐ، امامؑ ہمارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں یہاں تک کہ ہمارے تمام اعمال اسی تصور کی نگرانی میں انجام پائیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم غیبت پر صرف لفظی ایمان رکھتے ہیں۔ معنوی ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ بے خبر افراد کے درمیان تو لفظی ایمان ممکن ہے کچھ فائدہ پہنچادے لیکن عالم الغیب خدا اور علم غیب کے حامل نبیؐ و امامؑ کے سامنے لفظی ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم زمانہ غیبت میں وقت ظہور کے لئے اپنے کو تیار کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے دماغ پر اس تصور کو طاری وساری وحاوی رکھنے کی مشق کرنا ہوگی کہ امامؑ ہمارے کاموں کو خود بھی ملاحظہ فرماتے رہتے ہیں اور اعمال لکھنے والے ملائکہ صبح وشام ہمارے اعمال نامے کو حضرت کی خدمت میں پیش بھی کرتے رہتے ہیں۔

ضد نہ کیجئے بلکہ تقلید کیجئے

سورہ بقرہ جو قرآن مجید کا دوسرا سورہ ہے۔ اس کی آیت ۱۸۳؍۱۸۴۔۱۸۵ میں روزہ کا حکم بیان کیا گیا۔ آیت ۱۸۴ میں ہے کہ کوئی شخص جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، وہ روزہ نہ رکھے بلکہ رمضان کے بعد ان روزوں کو رکھے۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے حضورؐ سفر میں واجب اور سنتی روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضورؐ سفر میں تھے اور قافلہ کے سارے مسلمان روزے سے تھے۔ دن ڈھلنے کے بعد یہ آیت اتری کہ سفر اور مرض میں روزہ نہ رکھو۔ حضورؐ نے اسی وقت کھانے پینے کا سامان طلب فرمایا اور سب کے سامنے روزہ افطار کیا اور مسلمانوں کو بھی افطار کرنے کا حکم دیا۔ مگر چند لوگ جو بخیال خود حضورؐ سے بھی کچھ زیادہ (معاذ اللہ) مقدس تھے انہوں نے روزہ کو مکمل کرنا چاہا۔ کہ تھوڑا دن رہ گیا ہے اب روزہ کھولنا اچھا نہیں لگتا۔ دن پورا کر لینا چاہئے پھر روزہ عبادت ہی تو ہے۔ اگر ہم روزہ رکھے رہیں گے تو مصروف عبادت ہی تو رہیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے روزہ نہیں کھولا اور اپنے تقدس اپنے ایمان، اپنے عقیدہ اور اپنے عمل کے غرور پر باقی رہے۔ حالانکہ جب خدا حکم دے اور نبی حکم خدا پر عمل کر کے دکھائے اس کے بعد جو شخص بھی اپنی بات پر اڑا رہے وہ دین وایمان سے منحرف ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان لوگوں کو ''عصاۃ'' گناہ گار، کا خطاب دیا۔ آپ کے فرمانے کے بعد تمام مسلمان ان کو ہمیشہ عصاۃ کہتے رہے۔ سوسائٹی میں ان کو ان کے خبیث عمل نے جو

جگہ دلائی تھی وہ ان کا مقدر بن گئی حضورؐ کی زندگی میں ان لوگوں کے نام سے ''عصاۃ'' کا لفظ نہیں مٹ سکا۔ البتہ حضورؐ کے بعد جب حالات ہی بدل گئے اور مسلم سماج میں حضورؐ کے بعد عصاۃ یعنی گناہگاروں، نافرمانوں کا دور دورہ ہوگیا تو اب کون ان کو کس منھ سے عصاۃ کہتا۔ سب ہی ان کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔

ناواقف اسے اتفاق کہہ سکتا ہے لیکن عقل ایمان رکھنے والا ہر قلب مسلم اس کو خدائی انتظام کہے گا کہ قبلہ بدلنے کا حکم بھی حالت نماز میں آیا تھا۔ جس طرح سفر میں روزہ نہ رکھنے کا حکم روزہ کی حالات میں آیا حضورؐ نے عین حالت نماز میں بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف منھ کرکے باقی نماز ادا کی۔ اس وقت بھی کچھ بزعم خود زیادہ مومن اور مقدس مسلمان سوچتے رہ گئے تھے۔ تعمیل کے بجائے الٹا خدا اور رسولؐ کے بارے میں سوچنے لگے کہ یہ کام تو نماز کے بعد بھی ہوسکتا تھا۔ (ان کے خیال میں) نماز خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ حالانکہ عبادت صرف حکم خدا کی تعمیل کا نام ہے۔ اور اسی خالص تعمیل کو دیکھنے اور دنیا کو دکھانے کے لیے خدا نے حالات نماز میں قبلہ بدلنے کا حکم بھیجا اور حالات روزہ میں سفر میں روزہ توڑنے کا حکم بھیجا۔

مندرجہ بالا دونوں باتوں میں مصلحت الٰہی یہی تھی کہ کسی رائج عبادت کو اہمیت دینے کے بجائے حکم خدا کو اہمیت دی جائے۔ اسی مصلحت الٰہی کو ظاہر اور واضح کرنے کے لیے امام حسین علیہ السلام عین حالت سجدہ میں نبیؐ کی پیٹھ پر آکر بیٹھ گئے تھے اور حکم خدا کے مطابق نبیؐ نے سجدہ کو حسینؑ کے اترنے کے انتظار میں طول دیا تھا۔ تابع احکام الٰہی وسنت نبوی سجدہ میں رہے تھے اور اپنے خیال کے ''بڑے مومن'' بڑے محبّ، بڑے مقدس ومتقی'' خدا و نبیؐ و امامؑ کی نظر میں ''عصاۃ''، نافرمان، گناہگار، قابل مذمت

وملامت'' قرار پائے تھے۔ ان کی نظر میں حسینؑ سے خدا تک سب قابل اعتراض تھے۔ (معاذ اللہ)

ان تینوں واقعات سے آج کے مسلمان کو سبق لینا چاہئے کہ کسی کے خیال کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ قیمت صرف حکم خدا، حکم نبیؐ، حکم امامؑ کی ہے۔ آج حکم خدا کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ اعلم فقیہ ومجتہد کی تقلید کرنا ہے اور ان کے فتوے پر عمل کرنا ہی حکم الٰہی کی تعمیل ہے۔ عبادت ہے۔ اسلام ہے۔ ایمان ہے۔ محبت اہلبیت علیہم السلام ہے۔ ورنہ اپنے خیال پر عمل کرنے والے یا کسی کے خیال کی اطاعت کرنے والوں کو صرف عصاۃ، نافرمان کا خطاب ملے گا اور اس خطاب کے بعد صرف غضب خدا و نبیؐ و امامؑ کا سامنا کرنا ہوگا۔ جس کی عملی شکل عذاب ہے جو قبر سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا تقلید کیجئے یعنی اپنے کو ضالین ومغضوب علیہم کی فہرست میں شامل ہونے سے بچاتے ہوئے صراط مستقیم پر چلئے تاکہ اہلبیت علیہم السلام کی پیروی کا پھل جنت ونعمات جنت حاصل ہو۔

حکومت وشریعت کے قوانین پر یکجائی عمل کیونکر ہو؟

آج پوری دنیا کی صورت حال یہ ہے کہ سوائے ایران کے فی الحال کسی جگہ شریعت کی حکومت نہیں ہے۔ ہر جگہ کا مسلمان اس مشکل سے دوچار ہے کہ قوانین حکومت اور ہیں اور شریعت کے احکام اور ہیں۔ یہ مشکل صرف ان ملکوں کے مسلمانوں کو نہیں ہے جو غیر مسلم ممالک میں رہتے ہیں بلکہ مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمان بھی اسی مشکل میں گرفتار ہیں۔ جہاں روس، چین، امریکا، انگلستان، کناڈا، ہندوستان وغیرہ غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہے کہ وہ حکومت کے احکام پر عمل کریں یا شریعت کے احکام پر۔ وہاں سعودی عرب، عرب امارات، پاکستان، انڈونیشیا، بنگلادیش، مصر، ترکی وغیرہ مسلم ممالک کے باشندوں کے سامنے بھی یہی مسئلہ مشکل ہے کیونکہ اسلامی قوانین کی حکومت کہیں نہیں ہے۔ جہاں جمہوریت، سوشلزم، سیکولرزم، کمیونزم، ڈکٹیٹرشپ یا آمریت ہے۔ وہاں کے قوانین بھی غیر اسلامی ہیں اور مسلم ممالک حتیٰ کہ سعودی عرب جو عرصہ سے اسلامی حکومت کی چودھراہٹ کر رہا ہے وہاں بھی اسلام کی حکومت نہیں ہے۔ اسلام میں نہ شاہی ہے نہ نسلی حکمرانی ہے اور سعودی عرب کا حاکم بادشاہ ہوتا ہے او رصرف سعودی خاندان کو حکمرانی کا حق ہے۔ منڈی

ڈاڑھیاں احکام اسلامی کی دھجیاں اڑا رہی ہیں۔ ناچ اور گانے کے پروگرام ٹیلی ویژن پر برابر آتے ہیں۔ عوام ملوکیت کی چکی میں پیسے جارہے ہیں۔ مختصر یہ کہ جس حکومت کی بنیاد خاندانی شاہی پر ہے اس کے اسلامی ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ شاہان سعودی عرب کی شراب خواری اور عیاشی کی بین الاقوامی شہرت ہے۔ نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے بلکہ انسانوں کے بنیادی حقوق بھی یہ لوگ امریکہ اور روس کے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں تاکہ ان کی حکومت باقی رہے۔ مصر، ترکی وغیرہ غیر مسلم ممالک سے بھی بدتر غیر اسلامی کردار رکھتے ہیں۔ کل ایران بھی اسی صف میں تھا۔ ایران میں شاہ اور خمینی کا فرق نہیں ہوا ہے بلکہ بنیادی فرق یہ ہے کہ کل اسلام کو ایران سے دیس نکالا دیا گیا تھا۔ آج ایران میں اسلام اور صرف اسلام کی حکومت ہے۔

مختصر یہ کہ چاہے وہ ممالک ہوں جو مسلم کہلاتے ہیں یا غیر مسلم ممالک ہوں کسی جگہ اسلام کی حکومت نہیں ہے لہٰذا ہر جگہ کے مسلمان کے سامنے یہ الجھن موجود ہے کہ وہ حکومت وشریعت میں کس کا کہنا مانے۔ کس کا کہنا نہ مانے۔ ایک کے نہ ماننے کا حشر جیل ہے دوسرے کے نہ ماننے کا حشر دوزخ ہے۔ اور کوئی شخص بھی نہ جیل جانا چاہتا ہے نہ دوزخ۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ دوہری وفاداری نہ وفاداری ہے نہ اس پر عمل ممکن ہے۔ انسان انفرادی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی تک صرف کسی ایک ہی کا وفادار ہوتا ہے دوہری وفاداری کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ دوغلہ پن کو بھی وفاداری مان لیا جائے۔ جن گھروں میں ساس بہو میں ماں باپ میں، نند بھاوج میں، بھابھی دیور میں لڑائی ہوئی ہے اس گھر کا ہر آدمی حیران رہتا ہے کہ یہ کس کا ساتھ دے۔ کس کا ساتھ نہ دے سب کو راضی رکھنا ناممکن ہوتا ہے۔ البتہ اگر گھر کے سب آدمی شریعت کے احکام

کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ سب صرف شریعت کے وفادار رہیں تو جھگڑے نپٹائے جاسکتے ہیں۔حق بات کہی جاسکتی ہے۔ سب کو حق ماننے اور حق دینے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔اور سب کو راضی بھی رکھا جاسکتا ہے ورنہ تو جھگڑا ہی جھگڑا رہے گا اور حیرانی پریشانی میں اضافہ کرتی رہے گی۔

غرضکہ مسلمان عالمی سطح پر اس الجھن کا شکار رہے کہ حکومت وشریعت میں کس کا وفادار رہے۔ کس کے قوانین پر عمل کرے۔ جب تک اس مسئلہ کا عملی اور فکری حل سامنے نہیں آئے گا۔عملی مشکلوں اور زحمتوں کو حل کرنا اور ان پر قابو پانا بالکل ناممکن رہے گا۔

اس گتھی کو سلجھانے کے لیے حسب ذیل امور پر غور ضروری ہے۔

۱۔ اسلام مذہب ہے جو مرتے دم تک تبدیل نہیں ہوسکتا لیکن آدمی شہریت بدل سکتا ہے۔

۲۔ اسلام کا قانون ساز خدا ہے لہٰذا اس کے بنائے قوانین کو کبھی غلطی کی بنا پر تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ حکومتوں کے قوانین روزانہ ترمیم کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور غلطی پر غلطی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

۳۔ اسلام کا خدا نبیؐ، امامؑ سب ناقابل تبدیل ہیں اور حکومتیں روز بدلتی رہتی ہیں۔

۴۔ مذہب کی سرحد دنیا وآخرت دونوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور حکومت کی سرحد بس دنیا تک ہے۔آخرت حکومت کی گرفت سے باہر ہے۔

۵۔ مذہب تصور خالق اور عقیدہ آخرت کے ذریعہ ہر حال میں انسان کو سیدھا چلنے پر آمادہ کرنے کی بھرپور طاقت رکھتا ہے۔اور آخرت مکمل انصاف کا واحد سہارا ہے۔اس کے برخلاف حکومت ظالم کے ہاتھ میں بھی آجاتی ہے تو انصاف

مفقود ہو جاتا ہے اور نااہل کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو قوانین پر عمل کرانے کی صلاحیت نہیں رہتی ہے۔

۶۔ مذہب کے ماننے والے کو حکم خدا کے سامنے سر جھکانا ہے۔حکم بدلوانے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔لیکن عوام کو قوانین حکومت بدلوانے کا حق ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا چند امور کی روشنی میں ہر آدمی یہی فیصلہ کرے گا کہ اگر کسی وقت حکومت یا شریعت میں سے کسی کی نافرمانی کرنا پڑے تو اس کام کے لیے شریعت کا انتخاب نہیں کیا جاسکتا۔لیکن کیا ہم شریعت کے لیے حکومت کی مخالفت کرسکتے ہیں۔ بلکہ کیا شریعت نے ہم کو پابند کیا ہے کہ ہم ہر تباہی مول لے کر شریعت کی پابندی کریں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ہم کو ہر حال میں حکومت کے قوانین پر بھی صرف شریعت کے ذریعہ عمل کرنا ہے۔کسی حال میں بھی ہم شریعت کی مخالفت نہیں کرسکتے۔شریعت کو معطل نہیں کرسکتے ہمارا پہلا فریضہ ہوگا کہ ہر مسئلہ میں ہم وہ راہ پیدا کریں کہ شریعت کے عذاب اور حکومت کے عتاب سے محفوظ رہیں۔مثلاً حرام اور نجس چیزوں کی تجارت نہ کریں حرام نوکریاں نہ کریں۔کم کھائیں مگر حلال کھائیں اور جنت پر قناعت کریں۔ البتہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ شریعت اور حکومت میں ناقابل حل تضاد ہو تو جس طرح ہلاکت سے بچنے کے لیے ضرورت بھر حرام حلال ہو جاتا ہے اسی طرح ضرورت بھر شریعت کی خلاف ورزی کا حکم شریعت خود دے گی۔

مختصر یہ کہ شریعت کے خلاف ہم ایک سانس نہیں لے سکتے۔ بلکہ جس وقت جو حکم شریعت ہو اس پر عمل کرنا ہوگا۔معصوم نے اسی لیے فرمایا۔ کہ جو شخص تقیہ کے موقع پر تقیہ نہیں کرے گا اس کا یہ گناہ معاف نہ ہوگا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ہم کو ہر حال میں شریعت کی پابندی کرنا اور ہر مسلہ میں شریعت ہماری کیا ذمہ داری طے کرتی ہے اسے فقیہ سے معلوم کرتے رہنا ہے۔ تا کہ ہم ہر حال میں صرف شریعت ہی کے پابند رہیں۔

جاتا رمضان
آتی عید اور ہم

انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے دنیا کی حقیقت مختلف مثالوں کے ذریعہ سمجھائی ہے۔ کسی نے فرمایا دنیا ایک پل ہے جس سے گذر کر آدمی آخرت میں داخل ہوتا ہے۔ پل سے وہی لوگ آسانی سے گذرتے ہیں جو خود بھی ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور جن کا سامان بھی کم سے کم ہوتا ہے۔ دنیا کی ہلکی پھلکی زندگی کہ سامان بھی کم ہو اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان دنیا کی خواہشات میں پڑنے کے بجائے آخرت کی آرزو رکھے اور دنیا جمع کرنے کے بجائے آخرت میں اعمال کے ذریعہ ثواب جمع کرے۔ روزہ زندگی کو ہلکا پھلکا بنانے اور سامان کم کرنے کی ایک مشق ہے جو ایک ماہ جاری رہتی ہے بشرطیکہ آدمی روزہ رکھے یعنی زندگی کو ہر گناہ سے بچائے ورنہ گناہوں کا کرنا اور روزہ سے رہنا ایک فاقہ ہے روزہ نہیں ہے یہ فاقہ بھی روزہ نہ رکھنے کے عذاب سے ضرور بچالے گا۔ البتہ اگر روزہ ہے تو پھر ثواب اور رحمتوں کی بارش بھی ہوگی۔

معصوم کا دوسرا قول ہے کہ دنیا ایک موج ہے ایک لہر ہے۔ موج اور لہر ٹھہر نہیں سکتی۔ اسی لیے دنیا کسی کے پاس نہ ٹھہری ہے نہ ٹھہرے گی۔ امامؑ نے فرمایا اگر دنیا کسی کے پاس ٹھہرتی تو تم سے اگلے لوگوں کے پاس ٹھہر جاتی اور تم تک نہ آتی۔ اگلوں کو چھوڑ کر

تمہارے پاس آئی ہے تو تم کو بھی چھوڑ کر دوسروں کے پاس چلی جائے گی۔موج کی یہی صفت ہے کہ ابھی یہاں اور فوراً وہاں۔موج سے فائدہ حاصل کرنے کا ذریعہ کشتی ہے اور خداوند عالم نے ہم کو اہل بیت علیہم السلام کے دامن سے چمٹے رہنے کی ہدایت اسی لئے کہ ہے کہ یہی وہ کشتی ہے جو ضامن نجات ہے بلکہ واحد ذریعہ نجات ہے۔

تیسرا قول امام چہارم حضرت زین العابدین علیہ السلام کا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ دنیا جاری ہے اور آخرت آرہی مگر انسان جاتی ہوئی دنیا کی طرف بھاگتا ہے۔اور آتی ہوئی آخرت کا استقبال نہیں کرتا ہے۔آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر اک درہم کھو جاتا ہے تو تم اسے دن بھر ڈھونڈھتے ہو اور اس کا غم کرتے ہو مگر وقت یعنی تمہاری عمر گذرتی جاتی ہے تم کو اس کے جانے، ضائع ہونے کا نہ غم ہے نہ فکر۔جب کہ درہم کا بدل مل جائے گا۔مگر نہ عمر کا بدل ملے گا نہ گیا وقت ہاتھ آتا ہے۔

اس وقت ہماری صورت حال بھی یہی ہے کہ رمضان کا مبارک مہینہ جارہا ہے جس میں گناہ معاف ہوتے ہیں جس میں تقاضائے ایمان پورا کرنے والے صاحبان ایمان کی روزی میں اضافہ ہوتا ہے جس میں سال بھر نہ قبول ہونے والی دعائیں بھی قبول ہو جاتی ہیں مگر ہم کو اس مہینہ کا آنا ناگوار اور جانا پسند ہے کیونکہ ہم نے اس کو زحمت کا مہینہ سمجھ رکھا ہے۔اس کی رحمتوں سے بے خبر ہیں لہٰذا رمضان کے ختم ہونے سے پہلے ہماری آنکھیں کھل جانا چاہئے۔اور مغفرت، وسعت، رزق، قبولیت دعا کی رحمتیں سمیٹ لینا چاہئے۔ورنہ آنے والی عید یوم مسرت نہ ہوگی۔بلکہ یوم غم ہوگی۔یوم نفرت ہوگی۔یوم غضب ہوگی۔قبر سے محشر تک ہم کو معلوم ہوگا کہ بے روزہ دار کی عید، گناہگار کی عید کیسا غم دے گی۔ملائکہ کی کیسی شدید نفرت کا سبب بنے گی۔خدا و نبیؐ، امامؑ کے کیسے شدید غیظ

وغضب کا سبب بنے گی۔ہم جس عید کی تیاری لباس اور لذیذ کھانوں سے کررہے ہیں یہ سماجی تیوہار ہے۔مسلمان کی عید نہیں ہے۔

اور نہ یہ عید محمد وآل محمد علیہم السلام کے لیے باعث زیادتی شرف وعزت وغیرہ ہے جیسا کہ نماز عید کے قنوت میں عید کی تفصیل بیان کی گئی ہے لہٰذا ہم کو عبادت، توبہ، صدقہ، مومنین سے ایثار ومحبت اور ادائے حقوق کے ذریعہ جاتے رمضان سے برکت حاصل کرلینا چاہئے اور آتی عید کا اسلامی استقبال کرنا چاہئے۔

عید بندگی کی ترقی کا دن ہے تہوار نہیں

سماج انسانوں کے بہاؤ کا نام ہے۔ بہاؤ بے قاعدہ بھی ہوتا ہے اور باقاعدہ بھی۔ باقاعدہ بہاؤ کے لئے نہریں بنتی ہیں۔ باندھ بنتے ہیں جن سے بنجر آباد ہوتے ہیں۔ باغ سرسبز ہوتے ہیں۔ کھیتیاں لہلہاتی ہیں۔ فصلیں اگتی ہیں۔ میوے پھلتے ہیں۔ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ گھر روشن ہوتے ہیں۔ کارخانے چلتے ہیں۔ آدمی راحت وآرام اٹھاتے ہیں۔ اور بے قاعدہ بہاؤ سے سیلاب آتے ہیں کنارے کٹتے ہیں زمینیں برباد ہوتی ہیں اور مکان تباہ۔ کھیتی ستیاناس، باغ اجاڑ اور بستیاں ویران ہوتی ہیں۔ اور تباہیاں ہی تباہیاں پھیلتی ہیں سماج یعنی انسانوں کے بہاؤ کو قاعدہ کے اندر رکھنے کی انسانی کوشش کا نام قانون وعدالت وحکومت ہے۔ اور الٰہی کوشش کا نام دین ومذہب وشریعت ہے۔ لیکن منھ زور سماج ہمیشہ قانون شکن بھی رہا ہے اور مذہب دشمن بھی۔ سماج نے انسانوں کو رسموں کے ذریعہ بھی برباد کیا ہے اور تہواروں کے ذریعہ بھی تباہ کیا ہے۔ رسمیں اور تہوار دونوں مطلق العنان ہیں۔ مادرزاد آزاد ہیں۔ صحیح یا غلط کے پیمانہ سے ان کو ناپنا ممکن نہیں ہے۔ ان کو غلط کہنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی اصلاح کا نام لینا جرم ہے۔ پاک پروردگار بھی معاذ اللہ ان سے چھوٹا ہے۔ رسوم اور تہوار سب سے بڑے ہیں۔ تہوار میں گھر پھونک

تماشہ دیکھا جاتا ہے۔ تہوار میں پتھر مارے جاتے ہیں، کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ آدمی کو بن مانس بنا دیا جاتا ہے۔ گھروں سے نکلنا ناممکن بنا دیا جاتا ہے بلکہ گھروں میں گھس کو تہواروں کا ننگا ناچ ہوتا ہے نہ ہولی پر تنقید ہوسکتی ہے نہ نوروز کے بارے میں زبان کھلی جاسکتی ہے۔ دونوں تہوار ہیں۔ تہوار کو صرف سماج پیدا کرتا ہے۔ لیکن تہوار کو فوراً مذہبی بنا دیا جاتا ہے تاکہ اس کے سارے عیوب کو مقدس بنا کر تنقید سے بالاتر کر دیا جائے۔ مذہبی ہونے کے بعد نہ غیر لب کشائی کرسکتا ہے۔ نہ اپنا زبان ہلاسکتا ہے۔ غیر لب کشائی کرے تو فرقہ وارانہ فساد ہوجائے۔ اپنا زبان ہلائے تو بے دین اور مرتد ہوجائے۔ مذہب کا ربط نہ رسموں سے ہے نہ کوئی بندھن تہواروں سے ہے۔ بلکہ مذہب دونوں کو بے اعتدالی، اسراف، ضیاع، عقل ومال ووقت قرار دیتا ہے۔ منع کرتا ہے۔ اظہار بیزاری کرتا ہے۔ لیکن جس طرح یزید امیر المومنین بن بیٹھا۔ اسی طرح رسمیں اور تہوار مذہبی بن بیٹھے۔ شب برأت کا حلوہ، عید کی سوئیں، بقرعید کے ماش چاول، نوروز کی رنگ بازی کا مذہب سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ مگر ان کی ادائیگی فریضہ مذہبی سے برتر واعلیٰ واشرف ہے۔

۱۵؍شعبان کی رات عبادت میں بسر ہو۔ صبح امامؑ کے حضور میں حاضری ہو کسی کو اس کا خیال نہیں۔ رمضان کی ماہانہ عبادت کی انجام دہی کے شرف ومسرت کا نام عید ہے۔ مگر رمضان بھر خدا کا منھ چڑھایا (معاذ اللہ) اور عید کے دن ہر غریب کے زخم پر نمک چھڑکا۔ دن بھر گانا سنا اور تصور یہ کہ اسلامی مقدس تہوار کو انجام دے رہے ہیں۔ جب عذاب کے سانچہ میں شخصیتوں، مالداروں، بے دینوں کی ______ سوئیاں بنیں گی تب عید کی خرمستیوں کا پتہ چلے گا۔

بقرعید کا تعلق نہ اسلام سے رہ گیا ہے نہ ایمان سے یہ تو خالص مال داروں، دھنا سیٹھوں، اور ذمہ داروں کے مقابلہ اور دکھاوے کا تہوار ہے۔ جانور قیمتی ہو۔ کئی جانور ذبح ہوں۔ بڑے جانور ذبح ہوں، کمپٹیشن ہو اور اس کا اشتہار ہو مختصر یہ کہ بقرعید کے جانوروں کا تہوار بن گیا۔ اسے انسان سے کیا تعلق مذہب کو بدنام کرنے کا ذریعہ ہے مگر نام ہے مقدس تہوار۔ عید، بقرعید کی نماز بھی تہوار ہے نہ صبح کی پڑھی، نہ ظہر کی پڑھیں گے کیونکہ یہ نمازیں تو اللہ کی ہیں۔ عید، بقرعید کی نمازیں تو تہوار ہیں۔ نماز کے بعد گناہ گلے مل رہے ہیں اور عید ہو رہی ہے۔ سنیما جا رہے ہیں اور عید ہو رہی ہے جوا ہو رہا ہے اور عید ہو رہی ہے۔ انسان ذلیل کئے جا رہے ہیں اور عید ہو رہی ہے۔ اسلام ذبح ہو رہا ہے اور عید ہو رہی ہے۔ یہ عید شیطان کی عید ہے۔ مسلمان کی عید نہیں ہے۔ مسلمان کی عید تو تعریف امیرالمومنین علیؑ نے فرمائی ہے کہ اگر اعمال قبول ہو گئے تو عید ہے۔ اب بتائیے کہ اس سال عید آئی یا نہیں آئی۔ اسی سال کیا، کسی سال بھی عید آئی یا نہیں آئی۔ نہیں عید اس زندگی میں آ ہی نہیں سکتی جس زندگی میں رمضان نہیں آیا عید رمضان سے اور بقرعید حج سے جڑی ہے۔ رمضان ہے تو عید ہے۔ حج ہے تو بقرعید ہے۔ ورنہ رحمت بعید ہے اور عذاب قریب ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ جب عید کے بعد یہ مضمون لکھا گیا تو مضمون بھی عید کے بعد پڑھے۔ لیکن نہیں امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا تم ہر دن کو عید بنا سکتے ہو کہ کیونکہ جو دن بغیر گناہ کے بسر ہو جائے وہ عید ہے۔ تو تہوار والی عید تو گذر گئی۔ ختم ہو گئی۔ لیکن بندوں کی عید۔ مسلمان کی عید، مومن کی عید، علیؑ کا کہنا ماننے والوں کی عید باقی ہے اور ہمیشہ اس کا سلسلہ باقی و قائم رہے گا۔

موت سے پہلے توبہ اور توبہ کے بعد قضا و کفارہ اور گناہ سے بچنا ہر دن کو عید

بنا دے گا۔ بغیر گناہ کے دن گذرتے جائیں اور عمریوں ہی بسر ہو جائے تو موت کا دن عید اکبر کا دن ہے۔ اس راز کو علیؑ کے اس برجستہ اور پر جوش فقرہ سے سمجھا جاسکتا ہے جو ابن ملجم کی مہلک قاتل، جان لیوا تلوار کے لگنے اور سر کے گھائل ہو جانے کے بعد آپ کی زبان مبارک پر آیا تھا۔ ''کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا'' آیئے علی کی بتلائی عید کے سلسلہ کو اپنی زندگی میں اپنے خاندان میں، اپنے سماج میں شروع کریں اور تہواروں کے چکر کو ختم کر دیں اور رسموں کے بھنور سے اپنے کو نکال لیں۔

محرم کے بعد

رات، دین، مہینہ، سال آتے جاتے رہتے ہیں اور عمریں تمام ہوتی رہتی ہیں جو کل تھے وہ آج نہیں ہیں۔ جو بچے تھے وہ جوان ہوگئے۔ جوان بوڑھے ہوگئے اور بوڑھے مرحوم ہونے کے قریب ہیں۔ ہماری سماجی زبان میں مرحوم ہونا بڑی غمناک بات ہے۔ کسی کو مرحوم کہنا بدشگونی ہے۔ کو سنا ہے، فلاں صاحب دکھائی نہیں دے رہے ہیں مثلاً ہم نے پوچھا، سننے والے نے کہا آپ کو نہیں معلوم وہ تو تین مہینے ہوئے مرحوم ہوگئے۔ ہم نے اس خبر کو سن کر بار بار افسوس ظاہر کیا کہ وہ مرحوم ہوگئے اور ہمیں خبر نہیں ہوئی ہم ان کی میت میں شرکت سے محروم رہ گئے ان کی اولاد، ان کے گھر والے ان کی صورت دیکھنے، آواز سننے سے محروم ہوگئے اب جوان کا وارث ملا تو ہم نے تعزیت پیش کی۔ بڑا افسوس ہوا یہ معلوم کر کے کہ آپ کے والد مرحوم ہوگئے۔ انہوں نے بھی غم میں جوابی شرکت کرتے ہوئے کہا کہ جی ہاں ہم ان کی شفقت سے محروم ہوگئے۔ کاش ابھی کچھ دن اور وہ مرحوم نہ ہوتے، سماجی زبان میں مرحوم کی حیثیت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ جبکہ لغت میں مرحوم کے معنی ہیں، جس پر خدا رحمت نازل کرے اور محروم اسے کہتے ہیں جو کسی نعمت کو نہ پا سکے۔ اسی بنا پر دعاؤں میں جب یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو آدمی مرحوم ہونے کی دعا مانگتا ہے مثلاً رمضان کے آخری جمعہ کو یہ دعا مانگی جاتی ہے کہ اس رمضان کو میری زندگی کا آخری رمضان نہ قرار دے لیکن اگر تیری مشیت میں یہ طے

ہو چکا ہے کہ یہ میری زندگی کا آخری رمضان ہے تو پھر اے خدا ہم کو مرحوم قرار دے یعنی مرنے کے بعد ہم تیرے عذاب سے محفوظ رہیں اور تیری رحمتوں کے مستحق قرار پائیں۔ اے خدا ہم کو ہرگز ہرگز مرحوم کے بجائے محروم نہ قرار دینا۔ اس دعا کی روشنی میں مرحوم کے لفظ کے حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ کس قدر خوش آئند لفظ ہے۔ اس لفظ سے تمام تمنائیں اور آرزوئیں وابستہ ہیں۔ اگر ہم اس لفظ کے مستحق قرار پاگئے تو پھر سب کچھ مل گیا اور اگر ہم مرحوم نہ ہو سکے تو پھر کچھ نہیں ملا۔ لہٰذا مرحوم ہونا بڑی خوشی کی بات ہے اور محروم ہونا بڑے غم کی بات ہے۔

سال کے بارہ مہینوں میں جس طرح رمضان بہت سی خصوصیتوں اور اہمیتوں کا حامل ہے۔ اسی طرح محرم کا مہینہ بھی بڑی اہمیت و خصوصیت کا حامل ہے۔ رمضان اللہ کا مہینہ ہے۔ شعبان رسول اللہ کا مہینہ ہے۔ اور محرم نواسہ رسولؐ امام حسین علیہ السلام کا مہینہ ہے۔ بلکہ حسینؑ کا غم تو کم از کم ۲۰ رصفر تک ورنہ ۸ رربیع الاول تک جاری رہتا ہے ایام عزا میں ماہ محرم کے ابتدائی دس دن ایسی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان دنوں میں دنیا کے ہر حصہ میں ہر قوم کسی نہ کسی شکل میں حسینؑ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتی ہے۔ ایسے بھی بہت ہیں جن کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کب محرم آیا اور کب چلا گیا مگر یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو اپنی ہی خبر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کہاں سے آئے ہیں۔ کیوں آئے ہیں، کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے تو ان کی بات تو جانے دیجئے کیونکہ ان کو نہ اپنی خبر ہے اور نہ مرنے کے بعد کی خبر رکھنا چاہتے ہیں البتہ وہ لوگ جو خدا کو جانتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کو مانتے ہیں ان کو محرم کے آنے کی ضرور خبر ہوتی ہے بلکہ ان کو محرم کے آنے کا بھی انتظار رہتا ہے اور محرم کے جانے کا غم بھی ہوتا ہے۔ یہ محرم کا استقبال بھی آنسوؤں سے کرتے

ہیں اور محرم کو رخصت بھی آنسو سے کرتے ہیں۔جس طرح جس دن حسینؑ پیدا ہوئے تھے اس دن بھی ان کے گھر والے رو رہے تھے اور جس دن آپ شہید ہوئے اس دن سے لے کر آج تک سب آپ پر رو رہے ہیں۔ہم میں سے ہر شخص کو افسوس ہے کہ عشرہ محرم ختم ہوگیا۔اور ہم میں سے ہر ایک آدمی کی دعا بھی ہونا چاہیئے کہ خدا کرے یہ ہماری زندگی کا آخری محرم نہ ہو۔اور اگر یہ ہماری زندگی کا آخری محرم ہو تو اے خدا ہم کو مرحومین میں قرار دے۔محروموں میں شمار نہ فرما۔

لیکن ہم کو خود اپنا حساب بھی کرنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے افکار و اعمال کے ذریعہ اپنے کو کس صف میں کھڑا کیا ہے۔صرف تمنا سے کام نہیں چل سکتا۔تمنا کے بعد حصول تمنا کی کوشش بھی ضروری ہوتی ہے۔تمنا نہ ہوگی تو عمل کس کے لیے ہوگا لیکن عمل نہ ہوگا تو تمنا حاصل کیسے ہوگی۔عشرہ محرم گذرنے کے بعد ہم رحمت کے مستحق اسی وقت قرار پائیں گے۔جب ہم نے اپنی زندگی سے چن چن کر ہر وہ بات نکال پھینکنے کی کوشش کی ہو جو امام حسین علیہ السلام کو ناپسند تھی اور ہر اس بات کو اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہو جو امامؑ کو پسند تھی۔حسینؑ کی پسند اور ناپسند کو معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دینی تعلیم حاصل کریں۔کم از کم توضیح المسائل ہمارے مطالعہ میں ہر وقت رہتی ہو۔تا کہ ہر کام سے پہلے ہم معلوم کر سکیں کہ یہ کام جائز ہے یا ناجائز۔ہم جن عبادات کو انجام دے رہے ہیں وہ صحیح طور پر انجام پا گئیں۔یا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم عبادت بھی کریں اور ہماری جہالت اس کو ضائع و برباد بھی کر دے۔عبادتوں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ہم کو یہ فکر بھی ہونا چاہیئے کہ ہم گناہوں سے بچتے رہیں تا کہ ہماری عبادتیں قبول ہو جائیں۔مثلاً جس مال میں زکوٰۃ یا خمس واجب تھا اگر اس سے ہم نے مجالس میں تبرک تقسیم کیا، نذریں دیں، تو

ان نیکیوں کو قبول کرانے کے لیے لازم ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ اور خمس کو ضرور نکال دیں تا کہ ہماری عزاداری قبول ہو جائے اگر ہم میں سے کوئی خدانخواستہ اپنے ماں باپ کا نافرمان ہے تو اس کو جلد از جلد اپنے والدین کو راضی کرنا چاہیئے تا کہ اعمال قبول ہوں۔

اگر ہم نے اپنے عزیزوں کو چھوڑ رکھا ہے تو واجب ہے کہ ہم ان سے عزیزدارانہ تعلقات جلد از جلد بحال کریں کیونکہ صلہ رحم (عزیزوں سے تعلقات) واجب ہے اور قطع رحم (عزیزوں کو چھوڑ دینا) حرام ہے۔قطع رحم کرنے والے کی دعائیں رد ہو جاتی ہیں جب تک سانس باقی ہے آس باقی ہے اگر ہم نے کل نہیں عمل کیا تو آج بلکہ ابھی ہم کو متوجہ ہو جانا چاہیئے۔توبہ کا دروازہ موت سے پہلے تک کھلا رہتا ہے۔لیکن توبہ کے معنی ہیں اپنے کئے پر ایسی پشیمانی ہو کہ آئندہ اس غلطی کے دھرانے کی ہم میں ہمت نہ ہو جب تک ایسی شرمندگی نہ ہوگی، توبہ بے جان رہے گی۔توبہ میں جان اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم کو یہ احساس ہو کہ ہم نے کس کی غلطی کی ہے۔ہماری غلطی سے کون کون ناراض ہے۔ہماری غلطی نے ہم کو کن بلاؤں میں اور کیسی آفتوں میں پھنسا دیا ہے۔اس عذاب و سزا سے نجات پانے کا بس ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنے مالک کی ناراضگی کو دور کریں۔اپنے اگلے اعمال سے اس کو راضی کریں توبہ کا یہی راستہ ہم کو جناب حرؑ نے کربلا میں دکھایا نہ صرف دکھایا بلکہ اس پر چل کر چلنا سکھا دیا۔اگر حرؑ لشکر شام میں رہ جاتے تو محروم ہی محروم رہتے اور جب توبہ کا امتحان پاس کر لیا تو اب ان کا شمار ان مرحومین میں ہے کہ جو بھی ان سے وابستہ ہو جائے اس کی محرومیاں رحمتوں سے بدل جائیں۔اے خدا ہم کو بھی توفیق دے کہ ہم تیری رحمتیں حاصل کر سکیں۔

جشن

جس کا چراغاں کردار کو روشن کر دے

۱۴۰۵ھ میں جناب زینب سلام اللہ علیہا کا چودہ سوسالہ جشن ولادت منایا جارہا ہے۔ جشن منانا اظہار عقیدت بھی ہے۔ تاریخ کا زندہ کرنا بھی ہے اور سیرت کو پیش کرنے کا ذریعہ بھی ہے اور زندہ قوموں کی نشانی بھی ہے۔

جب یہ پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا اس وقت آپ جشن میں مصروف ہوں گے کامیاب جشن وہی ہے جس کا چراغاں کردار کو بھی روشن کر دے۔ جس کی آرائش زندگی کو سلیقہ مند بنا دے۔ جس کے کرداری اثرات نسلوں میں منتقل ہوتے رہیں۔ ہماری قومی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم بہتر سے بہتر کام کرتے ہیں مگر اس سے کمتر فائدہ بھی حاصل نہیں کرتے۔ تقریب مناتے ہیں مگر اپنے کو ممدوح کی سیرت سے قریب نہیں کرتے۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا کی جامع وحاوی اور محیط شخصیت سے ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق فوائد حاصل کر سکا ہے۔ مگر کم از کم چند باتیں ایسی ہیں جن کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔

ہمارے گھروں میں لڑکیوں کی تربیت دو طرح سے ہوتی ہے ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کو صرف ڈرنا سکھایا جاتا ہے۔ خوفزدہ گودوں میں پرورش پانے والی لڑکی نڈر کیسے

ہوسکتی ہے۔ اس میں تربیت کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اگر گھر پر کوئی آفت آجائے تو عورتیں اور لڑکیاں مصیبت میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ حالات سنبھالنے میں مدد دینے کے بجائے رکاوٹوں میں اضافہ کر دیتی ہیں اور بدترین صورت حال میں اپنی عزت کا تحفظ کرنے کی ہمت بھی نہیں رکھتی ہیں۔

دوسری تربیت جو اسکول کالج کی تعلیم کے رواج کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چونکہ تعلیم کا مقصد نوکری کرنا اور روزی حاصل کرنا ہے لہٰذا بے خوفی اور نڈری کی ایسی تربیت دی جاتی ہے کہ ماں باپ سے سرکشی خاندان والوں کی توہین، مذہب کا مذاق اڑانے کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کو صرف وہ آزادی، ملنا چاہئے جس کو حاصل کرنا ان کی تعلیم وتہذیب نے ان کو بتلایا ہے۔ چاہے اس راہ میں دین ایمان کا خاتمہ ہوجائے۔ چاہے شرم وحیا قربان ہوجائے۔ چاہے شرافت کا جنازہ نکل جائے، چاہے آبگینہ عزت چکنا چور ہوجائے۔ والدین، شوہر، اولاد سب کی زندگی بدمزہ ہوجائے مگر سوشل زندگی کی عصری آزادی کا ہونا ضروری ہے۔

دونوں غلط تربیتوں کے نقصانات آپ کے سامنے ہیں۔ اس کے برخلاف لڑکی کو نڈر بنایا جائے مگر اس اصول پر کہ جو خدا سے ڈرتے ہیں وہ پھر کسی سے نہیں ڈرتے کیونکہ ان کی خدا مدد کرتا ہے اور نازک ترین حالات میں بھی احکام خدا کی پابندی کے ساتھ بدترین دشمن کا مردانہ وار مقابلہ خدا پر یقین واعتماد کے سہارے کیا جاسکتا ہے۔

جناب زینبؑ نے ہم کو یہی خصوصی پیغام دیا۔ زمانہ میں شام عاشورہ اور شب غریباں سے زیادہ پُر آشوب پُر مصیبت وقت شاید نہ جمع ہوئے ہوں مگر اس موقع پر جناب زینب کی قیادت میں سن رسیدہ خواتین نے اور کمسن بچوں نے جس طرح حالات کا

مقابلہ کیا ہے۔اس کا اندازہ لگانا ان تقریروں سے بہت آسان ہے۔ جو جناب زینبؑ نے جناب ام کلثوم نے، جناب سکینہؑ نے کربلا، کوفہ، شام اور راہ اسیری میں کی ہیں۔

ہم کو اپنے گھروں کی تربیت کو خوف خدا اور خدا کے ماسوا ہر ایک سے بے خوفی کی بنیاد پر کرنا چاہئے تا کہ ہمارے گھروں کی عورتیں، لڑکیاں اور بچیاں نہ صرف اپنا تحفظ کرسکیں بلکہ دوسروں کی حفاظت کرسکیں بلکہ حفاظت کرنے والوں کی مددگار ثابت ہوں۔

آج اسلامی انقلاب نے جہاں اسلامی کردار کی ہر جھلک دکھائی ہے وہاں عورتوں کی پولیس پاسداران انقلاب عورتوں کے دستے، کردار سازی کرنے والی خواتین کی جماعتیں، کردار جناب زینبؑ کو پیش کررہی ہیں۔اس انقلاب کو ہمارے گھروں میں بھی آنا چاہئے تا کہ بے دینی کو گھر میں پناہ نہ ملے اور ہمارا ہر گھر ایک کرداری قلعہ بھی ہو اور کردار ساز انجمن بھی ہو۔

جناب زینبؑ نے غم بھی منایا۔ ترجمانی بھی کی۔ مصائب میں قیادت بھی کی اور ہر حال میں عبادت بھی کی۔

جبکہ پابند دین عورتیں بھی سفر میں، بیماری میں، تیمارداری میں، غمی میں، شادی میں، مہمانداری میں، مہمان نوازی میں بلکہ کسی بھی غیر معمولی مصروفیت میں واجب عبادتیں بھی چھوڑ بیٹھتی ہیں اور معمولی مصروفیت میں بھی نماز قضا ہونے کے وقت ہی پڑھتی ہیں حالانکہ جناب زینبؑ نے قید خانہ میں اپنے حصے کا کھانا پانی دوسروں کو دے کر فاقہ کرنے اور کمزور ہو جانے کے باوجود بھی نماز ادا کی اور جس گھرانے میں مستحب نماز بھی بیٹھ کر نہیں پڑھی جاتی تھی، اس گھر کی ممتاز ترین خاتون نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور صرف قید خانہ میں نماز نہیں پڑھی بلکہ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ میری

پھوپھی کی نماز شب بھی سفر اسیری میں قضا نہیں ہونے پائی۔ سیرت زینبؑ کو اپنانا سب سے بڑا جشن ہے جس سے شاہزادی مسرور ہوں گی۔

ہمارے گھروں کی عورتیں ذاتی طور پر اپنی عادتوں کی پابند ہیں اور سماجی سطح پر مہمل شکوک، لغو رسموں کی پابند ہیں۔ عادت یا رسم ورواج کے ترک کردینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی ہیں۔لیکن دین کے اہم ترین واجبات کی مخالفت میں ان کی کوئی باک نہیں، عورتوں کا سماجی مزاج سمجھنا ہو تو اس فقرہ پر غور کیجئے۔

''یہ شادی ہے شریعت نہیں ہے'' اگر ان کو مسائل بتلائے جائیں تو کان دھرنے پر تیار نہیں عمل کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر جناب زینبؑ نے مسائل کے علم کے باوجود آخری خیمہ کے جلنے کے وقت امام چہارمؑ سے پوچھا کہ اس وقت حکم خدا کیا ہے جل کے مرجانا یا بغیر چادر کے باہر نکلنا۔اگر چہ مرجانا آسان تھا مگر حکم خدا کی تعمیل کے لیے بی بی نکل آئیں اور سب کو نکال لائیں تا کہ وہ ہم کو پیغام دیں کہ ہر لمحہ کام سے پہلے حکم خدا معلوم کرنا بھی ضروری عادت ہے اور جل کر مرجانے سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالات میں دینی خواہشات کے برخلاف حکم خدا کی تعمیل کرنا ہمارا مذہبی فرض ہے۔

جناب زینبؑ کی قیادت میں جو سفر اسیران کربلا نے طے کیا ہے اگر چہ وہ اپنی تمام نوعیّتوں سمیت بے مثال ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے اس کے باوجود اس کی اس ممتاز خصوصیت کو بھی یاد رکھنا شرافت تاریخ کا فریضہ ہو جانا چاہئے کہ اس کٹھن راہ میں نہ کوئی کمسن یتیم رویا نہ مچلا نہ ضد کی بلکہ شریک سفر بھی رہا اور شریک مقصد بھی رہا۔

زینبؑ اپنے باپ کی زینت اسی لئے ان کا نام زین اب پڑا۔ کیا ہمارے گھر ہمارے گھروں کی عورتیں اور ہمارے بچے کردار زینبؑ کو اپنی زینت بنائیں گے۔

مسائل کو صرف قوانین شریعت کے ذریعہ حل کیجئے

مسائل کا تعلق جتنا محدود ہوتا ہے۔اسی حساب سے مسائل کی تعین کی جاتی ہے مثلاً انفرادی مسائل، گھریلو مسائل، خاندانی مسائل ،شہری مسائل،قومی مسائل، بین الاقوامی مسائل، ہم قوم کو قومی مسائل کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان مسائل کی حیثیت بنیادی ہے اگر یہ حل نہ ہوں گے تو قوم کو محرومی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

انسانی زندگی پیدائش سے موت تک جو سفر کرتی ہے۔اس کے چند اہم اسٹیشن ہیں جیسے پرورش، تربیت، تعلیم، ذریعہ معاش، شادی، مکان، خاندان، احباب، غیروں سے تعلقات، دشمن سے بچاؤ، اپنوں کی طرف جھکاؤ، بیماری، موت۔

کچھ اسٹیشن ایسے ہوتے ہیں جہاں ایک سمت سے گاڑیاں آتی اور جاتی ہیں اور کچھ اسٹیشن ایسے ہوتے ہیں جہاں سے مختلف سمتوں میں گاڑیاں روانہ ہوتی ہیں۔ایسے اسٹیشنوں کو جنکشن کہا جاتا ہے چونکہ انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی امتزاج زندگی کے ہر مرحلہ میں باقی رہتا ہے لہٰذا ہماری زندگی کا ہر اسٹیشن جنکشن ہے مثلاً بچہ کی پرورش ماں باپ کرتے ہیں مگر پرورش انفرادی ہو کر بھی اجتماعی مسئلہ ہے۔

مثلاً کتنے عرصہ کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوتا کہ پہلے بچہ کی پرورش بخوبی ہو سکے۔

یا ایسا انتظام کیا جائے کہ بیک وقت کئی بچوں کی پرورش ہو سکے۔ پرورش میں شرکت کرنے والے ماں باپ، بھائی، بہن، خالہ، ماموں، پھوپھی، چچا وغیرہ کی آسائش بھی متاثر نہ ہو اور بچوں کی پرورش بھی متاثر نہ ہو۔آسائش میں وقت،صحت، عادات،مشاغل سب ہی کو دخل ہے۔غرضکہ انسانی زندگی کا ہر اسٹیشن کسی مغلسرائے سے کم نہیں ہے مگر روزانہ مغلسرائے سے کم از کم دس ڈبے حرکت کرتے ہیں اور ہر طرف جانے والی گاڑیاں بہرحال مغلسرائے سے گذرتی ہیں تو ہر انسانی زندگی بھی روزانہ ہزاروں زندگیوں کے درمیان حرکت کرتی رہتی ہیں۔اور لوگ ایک دوسرے سے ملتے اور الگ ہوتے رہتے ہیں۔غرضکہ انفرادی زندگی کے گرد اجتماعی زندگی کی بے شمار بیلیں لپٹی ہوئی ہیں اور زندگی کو یوں بسر ہونا ہے کہ فرد کی انفرادیت بھی پھولے پھلے اور اجتماعی زندگی کا کوئی ریشہ بھی کچلنے نہ پائے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تال میل اتنا مشکل اور اتنا نازک اور اتنا باریک مسئلہ ہے کہ ہزاروں سال سے لاکھوں دانشوران گتھیوں کو سلجھانے میں لگے ہیں مگر ایک گرہ کھولتے ہیں تو دو گرہیں پڑ جاتی ہیں۔زندگی کی ڈور نہ سلجھتی ہے نہ توڑی جا سکتی ہے۔صرف عقل کے ناخن گھس جاتے ہیں اور فلسفے نڈھال ہو کر گوشہ گمنامی میں پڑ جاتے ہیں۔

اس مشکل مسئلہ کو خدا نے اپنے ہاتھ میں اسی لئے لیا کہ خدا کے علاوہ کسی کے پاس نہ کامل علم ہے، نہ کامل حکمت ہے لہٰذا مکمل روش حیات اس کے علاوہ کوئی مرتب نہیں کر سکتا ہے۔اس نے زندگی کی تمام الجھنوں کو دین و شریعت کے ذریعہ سلجھایا مگر انسانوں نے دین ہی کو الجھا دیا۔شریعت ہی میں دخل اندازی کر کے اس کی صورت بگاڑ دی۔لہٰذا جو دوا تھی اس سے مریض بھاگنے لگا اور جو مرض تھا اسے گلے لگانے لگا۔ہم بھی فکری

ریگستان میں حیران و پریشان رہتے اور بھوک پیاس سے بھٹکتے رہتے مگر ہم کو خدا نے قرآن مجید عطا فرمایا اور نبیؐ و آل نبی علیہم السلام سے وابستگی کی توفیق عطا فرمائی۔ اگر ہم قرآن سے نبیؐ و اہلبیت علیہم السلام کی سربراہی میں ہدایت حاصل کریں تو راستہ کی تلاش کا بوجھ ختم ہو جائے گا شریعت کی شکل میں انسانی زندگی کی شاہراہ موجود ہے۔ صرف ہم پر راستہ چلنے کی محنت کا بوجھ باقی ہے۔ مگر ہم عمل سے جی چراتے ہیں اور ناحق فکر بیجا میں اپنی جان کھپاتے ہیں سارے مسائل کا واحد حل ایک اور صرف ایک ہے کہ شریعت کے احکام کی روشنی کے مطابق ان کو حل کیا جائے اور شریعت کے مقرر کردہ قوانین پر عمل کیا جائے بچہ کے کانوں میں اذان و اقامت دینے کا حکم دیا گیا تاکہ ہم دونوں کانوں کو کھول کر سن لیں کہ ہم کو ولادت سے موت تک ہر مرحلہ میں دینی حدود میں رہنا ہے۔ لہٰذا پرورش، تربیت، تعلیم، شادی، مکان، خاندان، احباب، غیروں سے روابط، دشمن سے بچاؤ، اپنوں کی طرف جھکاؤ، بیماری، موت سب جگہ ہم کو پابند دین رہنا ہے۔ یعنی پرورش میں حرام یا نجس غذائیں بچہ کو نہ دی جائیں جہاں خون یعنی وراثت کے اثرات منتقل ہوتے ہیں۔ وہاں غذا بھی اپنے اثرات ڈالتی ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ شادی شریف خاندانوں میں کرو (خدا کی نگاہ میں شرافت انسانی کا نام صرف تقویٰ اور پرہیزگاری ہے) اور یہودیہ کا دودھ نہ پلواؤ۔ تاکہ نہ خراب خون سے پیدائش ہو نہ خراب خون پیدا ہو۔ سور کا گوشت کھانے والوں میں اس قدر بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کی بے حرمتی کو اپنی نگاہوں سے بھی برداشت کر لیتے ہیں جب پرورش دینی حدود میں لازم ہے۔ تربیت، تعلیم، شادی، مکان اور دوسرے سارے مسائل بھی پابند دین کے ساتھ حل ہونا چاہئے۔

ناوابستہ کانفرنس کے موقع پر صدر ایران حجۃ الاسلام خامنہ ای کی آمد پر ہندوستانی شیعہ علماء کو دہلی مدعو کیا گیا۔ صدر نہیں آسکے۔ وزیراعظم آئے۔ جب سفیر ایران علماء سے الوداعی ملاقات کرنے آئے تو انہوں نے ایک بڑی قیمتی بات کہی۔ جس کی طرف آج قوم کا کوئی آدمی متوجہ نہیں ہے۔

سفیر نے کہا تھا۔ ''جب تک آپ اپنی قوم کی تعلیم کا خود انتظام نہیں کرتے اس وقت تک نہ آپ کا مذہب محفوظ رہے گا نہ ملت باقی رہے گی۔''

یہ کہہ کر گذر جانا تو ممکن ہے کہ یہ کام ناممکن ہے۔ مگر سب جانتے ہیں کہ عمل اور جذبہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے، پھر جب مرض کا دفعیہ علاج سے ممکن ہے اگر ہم علاج کو ناممکن کہہ کر ٹال دیں تو موت یقینی ہے۔

غیروں کے ماحول میں تعلیم پانے والے، غیروں کے پڑوس میں رہنے والے، غیروں کے ہجوم میں نوکری یا کاروبار یا مزدوری کرنے والے غیروں کو دوست اور احباب بنانے والے، اپنی دنیا و آخرت دونوں کو برباد کر لیتے ہیں۔ اگر ذہن اور انداز فکر و عادات غیر اسلامی ہو گئیں تو پھر مسلمان نام کس کام کا۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم پوری قوم کی پوری طرح فطرہ، زکوٰۃ، خمس نکالنے پر آمادہ کریں اور تمام اقوام شرعیہ کو مکمل طور پر صحیح ہاتھوں تک پہونچائیں یہ ہاتھ جہاں دیانت دار ہوں اتنے اتنے لمبے اور ان تھک محنت کرنے والے ہوں کہ رفتہ رفتہ یہی پوری قوم کے مسائل تعلیم و تربیت شادی و ذریعہ معاش وغیرہ کو دینی بنانے کا سامان فراہم کریں۔

آج نجس غذائیں، ناجائز آمدنیاں، ملحد تعلیم، غیر اسلامی انداز فکر، خلاف اسلام شادیاں، حرام ملازمتیں اور تجارتیں، تباہ کن اور حرام رسمیں شادی اور غمی کے مواقع پر

ہمارے درمیان رائج ہیں۔ ہم ملحد پڑوسیوں میں جذب ہو گئے ہیں۔ رسموں کے ہاتھوں ایک آدمی کی موت خاندان اور وارثوں کو زندگی درگور کر دیتی ہے۔ ہماری شادیاں ایسی مالی اور اخلاقی تباہیاں لاتی ہیں، جن تباہیوں کا سلسلہ نسلوں کو متاثر کرتا ہے۔ کسی نو مسلم اور نئے شیعہ کو قبرستان میں قبر کی جگہ کے علاوہ ہماری سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ملتی ہے۔ نہ ہم اس کو لڑکی دیں گے نہ اس کی لڑکی لیں گے۔ ہم مسلمان ہو کر طبقات میں تقسیم ہیں۔

لڑکی بوڑھی ہو جائے یا شرافت میں مرجائے مگر ہم دوسرے طبقہ میں رشتہ نہیں کر سکتے۔ معذور لڑکے لڑکیاں والدین اور خاندان کے افراد کے ذہنوں کو مفلوج کر دیں مگر ہم تعدادِ ازواج کے ذریعہ یا متعہ کے ذریعہ بھی ان کے مسائل حل کرنے سے معذور ہیں۔ کیونکہ ہم سب کچھ ہیں مگر نام سے زیادہ مسلمان نہیں ہیں۔

دین چھوڑنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ لیکن ہم دنیا اور اپنے خاندان و معاشرہ کے ڈھرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔

ایک اکیلا تنظیم المکاتب قوم کو ان مسائل کی طرف ۱۶۔۱۷ سال سے آواز دے رہا ہے۔ اس کی آواز میں آواز ملائیے۔ قدم سے قدم ملائیے۔ اور پابندی دین کا سفر شروع کیجئے۔ خوف، شرم، ہچکچاہٹ ختم کیجئے اور غور سے کان لگا کر سنئے۔ ہمارا امامؑ ہم کو چلنے، آگے بڑھنے کے لیے آواز دے رہا ہے۔ کیا غلام اپنے امامؑ کی آواز پر دھیان نہ دیں گے۔ تو پھر کل کیا منھ دکھائیں گے۔ دینی تعلیم کو عام کیجئے۔ دینی پابندی کو عام کیجئے، پابند دین معاشرہ کو پیدا کیجئے۔ زندگی کو صرف حدود دین میں بسر کیجئے۔ اور مسائل کو فقط قوانین شریعت کے ذریعے حل کرنے کی عادت ڈالئے۔ پھر دیکھئے کہ دنیا ہی جنت بن جائی ہے یا نہیں۔

عذاب خدا سے صرف شریعت کی پابندی بچا سکتی ہے

جاننا بہتر ہے نہ جاننے سے۔ یہ بات سو فیصد درست ہے اور زندگی کے کام مسائل کی بنیاد ہے۔ البتہ کبھی نہ جاننا بہتر محسوس ہوتا ہے جاننے سے۔ مثلاً انسانوں کے عیوب جاننے کے لیے کن سُنی سے کام لینا اور چھپ کر گفتگو سننا۔ ایک موقع ہے۔ جہاں نہ جاننا بہتر ہے جاننے سے۔ لیکن ایسے مواقع اور ایسے مقامات جہاں نہ جاننا بہتر معلوم ہوتا ہے اگر ہم ان مواقع اور مقامات کی چھان بین کریں گے تو اس حقیقت تک پہنچیں گے کہ درحقیقت علم ہر جگہ بہتر ہے۔ اور نہ جاننا ہر جگہ بدتر ہے۔ البتہ کبھی جاننا اور بتلانا اس لئے ممنوع قرار دیا جاتا ہے کہ جس کو بتلانا ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس علم کا متحمل ہو سکے۔ اور تحمل سے زیادہ بوجھ ڈالنا ممنوع ہے۔ ہوا۔ پانی۔ غذا۔ روشنی سب مفید چیزیں ہیں۔ بلکہ زندگی کے لئے لازم ہیں۔ جن کا نہ ملنا ہلاکت اور موت کا سبب بن سکتا ہے لیکن کبھی یہ چیزیں بھی ممنوع ہو جاتی ہیں مگر نہ اس لئے کہ ان کی خوبی ختم ہو گئی بلکہ اس لئے مریض نمونیہ یا ہیضہ کا شکار ہے یا آنکھ کا آپریشن کرایا ہے تو ایسے حالات میں ہوا، پانی، غذا اور روشنی سے مریض کو روک دیا جاتا ہے۔

اسی طرح جب صلاحیت نہ ہو تو بتلانا ممنوع ہو جاتا ہے لیکن یہ خراب علم کی نہیں

ہے بلکہ جاننے والے کی خرابی وکوتاہی ہے مثلاً بہت سی باتوں کا بتانا بچوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا ہے لیکن جب وہ جوان ہوجائیں تو ان کو وہی باتیں بتلانا ضروری ہوجاتا ہے۔اسی طرح چوری، قتل، اغوا کے پلان کیسے بنائے جاتے ہیں ان کا عوام کو بتلانا مضر ہوتا ہے چنانچہ آج فلموں کو دیکھنے والے اور ناولوں کے پڑھنے والے نہ معلوم کتنے نوجوان ہیں جنہوں نے فلم اور ناول کی بنیاد پر جرائم کئے ہیں۔لیکن جن افراد کو مجرموں کو بے نقاب کرنے کی تربیت دی جاتی ہے ان کو ایسے تمام پلانوں کے بنانے کے طریقہ کی تعلیم دی جاتی ہے تا کہ وہ مجرم کی راہ کو پہچان کر مجرم تک پہنچ سکیں اور اس پر ہاتھ ڈال سکیں اور انسانوں کو مجرم کے خوف ودہشت سے نجات دلا سکیں۔

مختصر یہ کہ درحقیقت سو فیصدی، صد درصد، سنٹ پرسنٹ جاننا ہی بہتر ہے۔علم ہی افضل ہے۔بتلانا ہی خدمت ہے۔نہ جاننا ہی عیب ہے۔جہالت اندھیرا ہے رذالت وضلالت ہے۔گمراہی ہے اور نہ بتلانا گمراہ کرنا ہے۔اپنے قبضہ میں رکھنے کا ظالمانہ وسیلہ ہے۔انسانوں کو ہمیشہ جاہل رکھ کر لوٹا اور کھسوٹا گیا ہے۔اور ہر نفع خور ہمیشہ علم کا مخالف رہا ہے۔انبیاء ائمہ علیہم السلام کے جسموں اور ذہنوں پر جتنے زخم آئے ہیں وہ سب جہالت کے ہاتھوں لگے ہیں۔دین وشریعت جہالت کے ہاتھوں ہمیشہ مجروح ہوئی ہے۔جب جہالت کے ہاتھوں نسلیں موت کے گھاٹ اتاری جارہی تھیں اور سردار قبیلہ کی جھوٹی عزت پر چالیس چالیس سال خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی۔اور خون کی ندی میں سرداری، حکومت وعزت کی سنگدلی کشتی چل رہی تھی اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاہلوں کو تعلیم دینا چاہی تا کہ ان کے مصائب کا خاتمہ ہوجائے تو تمام نفع خور نہ صرف حضورؐ کے دشمن ہوگئے۔بلکہ انہوں نے ان ہی مصیبت زدہ افراد کو حضور کے مقابلہ

پر میدان جنگ میں لاکھڑا کیا۔اور مصیبت زدہ افراد نے نہ صرف اپنے مصائب میں اضافہ کیا بلکہ حضور پر بھی مصائب کے پہاڑ توڑے اور حضور کے بعد مصائب کے پہاڑ صدیوں ائمہ معصومین علیہم السلام پر توڑے گئے۔یہ صرف جہالت کے کرتوت تھے اور ہیں۔جہالت نے جو کچھ کفر کے ذریعہ کیا وہ سارے کام اسلام کے نام پر کئے۔

دین کے نام پر بے دینی کی ترویج کا مکروہ سفاک ومکار کام کھل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔اس سفاکی کا اختتام تو اسی دن ہوگا جس دن امیر عدل کا ظہور ہوگا۔لیکن زمانہ غیبت میں چراغ کو لو کو اونچی کرتے رہنا، دین کی تعلیم کو عام کرنا، عوام کو جہالت سے بچانے میں منہمک رہنا ہم سب کا فریضہ ہے اگر اس میں ذرا کوتاہی یا کمی کی تو ہم سب کو خدائے قہار کے غضب کا سامنا کرنا ہوگا۔اور سربراہان ایمان وتقویٰ کے غصہ ونفرت کا سامنا کرنا ہوگا۔ہمارے نبیؐ ولیؑ اپنے نام لیواؤں کو صرف اور صرف دیندار وپرہیزگار ومتقی دیکھنا چاہتے ہیں۔حضورؐ کا مشن، کیا عوام کیا خواص ہر فرد بشر کو اسلام سے واقف کرنا اور مکمل پابند اسلام بنانا تھا۔جو نبوت کا مشن تھا وہی امامت کا مشن ہے۔اور ہر مسلمان ومومن وعاشق رسولؐ وآل رسولؐ کا چن یہی تھا۔یہی ہے، اور یہی رہے گا کہ وہ دین جانے اور عملاً اس کی پابندی کرے اور پابندی کرائے۔اس سے بڑی کوئی بدچلنی نہیں ہوسکتی کہ ہم دین کو مانیں۔دین کے بھیجنے والے خدا، دین کے لانے والے نبیؐ، دین کے پھیلانے اور بچانے والے اماموں کو مانیں مگر نہ دین کو جانیں نہ اس پر عمل کریں۔بلکہ دانستہ یا نادانستہ گمراہیوں میں ایک دوسرے کے مددگار بنیں اور گمراہیوں کی تاریکیوں کو گہرا اور گھٹا ٹوپ بنانے میں حصہ لیں۔

دین کے دو حصے ہیں اصول دین وفروع دین۔اصول دین کا جاننا کافی نہیں

ہے۔ بلکہ سمجھنا ضروری ہے صرف سن کر مان لینا کافی نہیں۔اور فروع دین کا بھی جاننا کافی نہیں بلکہ ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ چونکہ انسانوں میں عوام اور خواص سب ہی ہوتے ہیں۔سب کی ذہنی صلاحیت اور علمی استعداد برابر نہیں ہوتی ہے۔لہٰذا مذہب اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جو سب سے کم صلاحیت اور استعداد والا بھی اٹھا سکے۔لہٰذا اصول دین میں ایمان اجمالی کو کافی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو شخص بھی توحید، عدل، نبوت، امامت، قیامت کے معنی سمجھ لے اور ان کو دلیل کے ذریعہ مان لے وہ مومن ہو جائے گا۔ دقیق مسائل کو اگر نہیں جانتا ہے تو بھی غیر مومن نہیں قرار پائے گا۔ کیونکہ تفصیل جانے بغیر وہ ان تمام باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو نبیؐ نے کہی ہیں کیونکہ اگر تفصیل ایمان کو معیار قرار دیا جائے تو کم علم اور کمزور ذہن والے ایمان سے محروم رہتے۔ البتہ جو صاحبان علم وفکر ہیں ان کا موقع ہے کہ وہ اصول دین کی تفصیل کا علم حاصل کریں۔ دقیق مسائل کو سمجھ کر دوسروں کو سمجھانے کے قابل ہو سکیں لیکن یہ خواص (علماء) کا فریضہ ہے۔عوام کا فریضہ نہیں ہے۔عوام کے سامنے اگر دقیق مسائل رکھے گئے تو ان کے گمراہ ہو جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

اسی طرح فروع دین میں بھی احکام خدا کا قرآن وحدیث سے تفصیلی علم حاصل کرنا عوام کو فریضہ نہیں قرار دیا گیا بلکہ یہ فریضہ خواص یعنی فقہاء کو قرار دیا گیا ہے کہ وہ تفصیلی دلائل کی روشنی میں ہر حکم خدا کو معلوم کرتے رہیں۔اور عوام کا فریضہ ہے کہ وہ مسائل کو فقہاء سے معلوم کرتے رہیں جن کی ان کو ضرورت پڑتی رہے اور عمل کرتے رہیں۔کیونکہ ہم پابند ہیں کہ کوئی کام حکم خدا کے خلاف نہ کریں۔احکام خدا کا علم حاصل کئے بغیر ہم اس پابندی پر نہ پورے اتر سکتے ہیں اور نہ اپنے کو عذاب خدا وسزا سے محفوظ

رکھ سکتے ہیں۔

ہماری سوسائٹی میں یہ خرابیاں پیدا ہوگئی ہے کہ ہم گناہ کو آسان سمجھتے ہیں اور عذاب وسزا سے اپنے کو محفوظ سمجھتے ہیں۔اس عہد کی اہم ترین ضرورت یہی ہے کہ پوری سوسائٹی میں ی مزاج رائج ہو جائے۔ رچ اور بس جائے کہ ہم پر صرف شریعت حاکم ہے یہی فرمان خدا اور رسولؐ وامامؑ ہے۔اور شریعت کے احکام کا علم صرف فقیہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔غیر فقیہ کا فریضہ صرف تقلید ہے۔ قیاس آرائی، تک بندی کی کوئی گنجائش شریعت میں نہیں ہے۔ یہ مزاج بھی سوسائٹی میں پیدا کرنا ضروری ہے کہ چھوٹے بڑے کام سب کاموں میں ہم کو ہر حالت میں نافرمانی سے بچنا ہے۔ زنا بھی حرام ہے اور گانا، باجا بھی۔ نامحرم کو دیکھنا، چھونا بھی حرام ہے۔اور ڈاڑھی منڈانا بھی حرام ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہم کو متوجہ اور متنبہ کیا کہ معمولی سی معمولی نافرمانی سے بھی بچو۔اس لئے کہ اگر نافرمانی معمولی بھی ہو تو جس خدا کی نافرمانی کر رہے ہو وہ عظیم ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں کہ مکرر نافرمانی عظیم گناہ بن جاتی ہے۔ چہ جائیکہ مسلسل نافرمانی۔ جس کا بدنصیبی سے ہماری سوسائٹی میں رواج ہوگیا۔ گناہ کے رواج کے بجائے پابندی شریعت کا رواج پیدا کرنا ہی دین اور مومنین کی خدمت ہے۔امام زمانہؑ اپنے غلاموں کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ کون کون اٹھتا ہے اور اس مہم میں شریک ہوتا ہے۔

کیا ہم رسموں میں جکڑے ہی رہیں گے

سرکار خطیب اعظم طاب ثراہ کا یہی وہ فکر انگیز اصلاحی اور تعمیری مضمون ہے جو اکتوبر ۸۲ء میں الواعظ کے ذبح عظیم نمبر میں اس کے صفحہ ۳۷ پر شائع ہوا تھا۔ صنعت تحریف میں کمال کہنہ مشقی کا ثبوت دیتے ہوئے مولانا عبدالعلی صاحب فاروقی کاکوروی نے اس مضمون کا ایک ایسا حصہ جس کا تعلق رسموں کے خلاف تھا اپنی کتاب میں نقل کر کے قاری کو یہ تاثر دینے کی کوشش ناکام کی ہے کہ مولانا سید غلام عسکری صاحب خدانخواستہ عزاداری کو رسم سمجھتے ہیں۔ مولانا عبدالعلی صاحب فاروقی سے زیادہ کمال عداوت کا مظاہرہ سرکار خطیب اعظم طاب ثراہ کے سیاسی حریفوں اور مذہبی دشمنوں نے کیا ہے جو فاروقی صاحب کی کتاب کو بغل میں دبا کر گلی گلی عوام کو بھڑکانے کے لیے یہ کہہ کر دکھاتے پھر رہے تھے کہ دیکھئے مولانا غلام عسکری صاحب نے عزاداری کے خلاف لکھا ہے جس کا حوالہ فاروقی صاحب نے اپنی اس کتاب میں دیا ہے۔ جبکہ شیعیت کے خلاف فاروقی صاحب نے اپنی

اسی کتاب میں اجلہ علماء شیعہ ائمہ معصومینؑ اور قرآن مجید کا حوالہ بھی دیا ہے اگر صرف فاروقی حوالہ سے سرکار خطیب اعظم کو دشمن عزا کہا جاسکتا ہے تو اجلہ علماء شیعہ، ائمہ معصومینؑ اور اللہ تعالیٰ کو کیا دشمن شیعیت کہنے کی جرأت کس میں ہے؟

ہم یہ مضمون اسی لئے شایع کر رہے ہیں تاکہ ارباب نظر پورا مضمون پڑھ کر خود فیصلہ کریں کہ فاروقی صاحب اور مخالفین سرکار خطیب اعظم کی تحریف اور ان کی کذب بیانی سے ممکن گمراہی کا سدباب ہو سکے۔

(ادارہ)

ریشم کا کیڑا خود اپنی آزادی کھوتا ہے۔ ریشم پیدا کرنے کے لیے منہ سے تار نکالتا ہے پھر انہیں تاروں میں اپنے کو مقید کرتا جاتا ہے اور ایک دن اپنے بنائے خول میں گھٹ کر مر جاتا ہے زندگی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی جب اس کی رسمیں بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو رسمیں ایجاد ہوتی ہیں رسموں کے ذریعہ گھریلو زندگی میں شادی اور غمی کی تقریبوں میں رونق طرفہ بڑھ جاتی ہے مگر آخر میں ہم بھی ریشم کے کیڑے کی طرح رسموں کے خول میں گھٹ گھٹ کر اپنی آزادی، بےفکری، ایمان، شرافت، خوشحالی حتیٰ کہ ذریعہ معاش کو بھی موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ رسمیں زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتی ہیں مگر ہم اپنے کو اپنے ہاتھوں مجبور کر چکے ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں خود کردہ را علاجے نیست لیکن اس مقولے میں ترمیم ممکن ہے کیونکہ جب ہم اپنے ہاتھوں تباہی لائے ہیں تو ہم ان کے ذریعہ نجات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ رسم یعنی وہ کام جو بغیر کسی سبب کے بغیر کسی معقولیت کے کیا جاتا ہے اس کی منطق بس یہی ہے کہ ہوتا آیا ہے لہٰذا ہوگا رسمیں جاہلوں اور غیر ترقی

یافتہ لوگوں میں بھی ہوتی ہیں اور تعلیم یافتہ اور ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے والوں میں بھی ہوتی ہیں، جاہلوں میں ماش چاول پکتے ہیں، پڑے لکھوں میں کیک کٹتے ہیں۔ نہ اس کی کوئی وجہ ہے نہ اس کی کوئی وجہ ہے۔

رسم لسانِ جاہلیت ہے اور جاہلیت جاہلوں اور پڑھے لکھے دونوں طرح کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ جاہلیت سے نہ سوسائٹی ٹکر لیتی ہے۔ نہ علم نہ عقل نہ قانون نہ حکومت نہ اخلاق بلکہ اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے، کہہ کر رسم کے لاف اٹھنے والی آواز کو دبا دیا جاتا ہے۔ اور پھر سب دب کر رسم کی عملی بالاتری مان لیتے ہیں صرف دین، مذہب اسلام رسموں سے ٹکر لیتا ہے مگر واہ رے اہل مذہب کہ انہوں نے مذہبی رسموں کی ایجاد کر ڈالی جب کہ مذہب میں رسم نام کی کوئی چیز پائی نہیں جاسکتی کیونکہ جو کام ہم کررہے ہیں اگر اس کا حکم خدا نے دیا ہے اور نبیؐ یا امام سے اس کی ہدایت ملی ہے تو وہ کام رسم نہیں ہے عبادت ہے۔ اطاعت ہے اور اگر ہم نے اس کا کرنا خود لازم قرار دے لیا ہے تو وہ ہماری ایجاد کردہ ہے اس میں مذہبیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے ہماری ایجاد کو مذہب سے منسوب کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ مذہب الگ ہے۔ رسم الگ ہے۔ ان دونوں کو مذہبی رسم کے ذریعہ متحد کرنے کا کوئی عقلی شرعی جواز نہیں ہے۔

رسوم اکثر مال و وقت وجسمانی و ذہنی توانائی وغیرہ کی بربادی کا ذریعہ بنتی ہیں مذہب ان سب کا تحفظ کرنے آیا ہے ان کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے آیا ہے لہٰذا مذہب اور رسم کی سیدھی ٹکر تو ہوسکتی ہے لیکن ان کے درمیان مذہبی رسوم کے نام پر فرضی صلح نہیں کرائی جاسکتی ہے۔ یہ فرضی صلح نہیں ہے بلکہ مذہب کی روگردانی ہے اور قدیم ترین بت ''رسم'' کی پوجا اور پرستش ہے زیادہ سے زیادہ مذہب جن کاموں کے کرنے یا نہ

کرنے کے بارے میں خاموش ہے یعنی جن کو مباح کہا جاتا ہے اگر کوئی رسم مباح کی حد تک ہے تو اس کو جائز رسم کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن کسی مباح کو بھی لازم کرلینے کے بعد جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان خرابیوں کے بعد اس جائز رسم کا بھی جائز رہنا مشکل ہے۔

رسم جائز ہو یا ناجائز بہرحال یہ طے ہے کہ مذہبی رسوم نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی اور نہ کسی کو حق ہے کہ کسی غیر مذہبی چیز کو وہ مذہبی قرار دے دے ضرورت ہے کہ رسموں کو ختم کیا جائے۔ مٹایا جائے اور خاص طور پر اس توہم پرستی کو ختم کیا جائے جو رسوم کا سب سے بڑا اسہارا ہے بلائیں واجبات چھوڑنے اور گناہ کرنے پر آتی ہیں کسی رسم کے چھوڑ دینے پر کسی بلا کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے البتہ رسوم کو چھوڑنے پر بلائیں دور ہوسکتی ہیں اور اگر کوئی بلا دور نہ ہوگی تو کم از کم رسموں کی پابندی سے جو مالی، معاشی، اقتصادی، ذہنی، اخلاقی بلائیں پیدا ہوتی ہیں وہ تو دور ہوجائیں گی۔

زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہماری عزاداری کو بھی رسموں نے جکڑ لیا ہے جس کے نتیجہ میں قریب ہے کہ عزاداری صرف ایک غمگین تقریب کی حیثیت اختیار کرلے اور واقعہ کربلا سے جو ایمانی، علمی، عملی، اخلاقی، انقلابی سبق ہم کو حاصل کرنا ہیں ہم ان سے بالکل محروم ہوجائیں۔

مجلس، جلوس، ماتمی انجمن، ذاکری، تبرک کی تقسیم، دسترخوان غرضکہ عزاداری سے متعلق تمام باتوں پر رسموں کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے اور ہم انقلابی عزادار ہونے کے بجائے رسموں کے پرستار کھوکھلے عزادار ہوتے جارہے ہیں۔

مگر صورت حال قابلِ اصلاح ہے۔ البتہ پہلے ہم اصلاح کی نیت کریں۔ صرف کسی ایک کی اصلاح کی نیت کافی نہ ہوگی۔ بلکہ ہر عزادار کو اصلاح کی نیت کرنا

ہوگی۔صرف نیت کافی نہ ہوگی۔ بلکہ اصلاحی اقدام بھی کرنا ہوں گے اور اصلاحی اقدام کے وقت ویسا ہی ہوشیار اور چوکنا رہنا ہوگا۔جیسی ہوشیاری کی ضرورت ان معماروں کو ہوتی ہے جو پرانی عمارت کے بوسیدہ اجزا کو بدلتے ہیں۔مثلاً چاروں دیواروں میں سے ایک دیوار کو بدلنا ہے یا دوسری منزل کو باقی رکھتے ہوئے پہلے منزل کی چھت بدلنا ہے۔نئ عمارت بنانے اور پرانی عمارت ڈھانے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہوتا ہے پرانی عمارت کی بنیادوں کو باقی رکھتے ہوئے اس کے کمزور اور بوسیدہ حصوں کو بدلنا۔

رسموں اور خصوصاً عزاداری اور ذاکری وغیرہ سے متعلق رسموں کو بدلنے کے لیے جو اصلاحی اقدام کئے جائیں اس میں بنیاد کو باقی رکھنا ہے اور رسوم کو نکال دینا ہے لہٰذا احتیاط لازم ہے کہ عقیدہ اور عقیدہ کے جذبات کچلنے نہ پائیں اور اصلاح بھی ہوجائے اس کا راستہ صرف یہی ہے کہ قوم کی مذہبی واقفیت میں بھرپور اور مسلسل اضافے کی کوشش کی جائے ان کو مسائل بتائے جائیں ان کے سوالات حل کئے جائیں ان میں فکر آخرت پیدا کی جائے۔دینی پابندی دین کا جذبہ ابھارا جائے ان کو واجبات سمجھائے جائیں اور گناہوں سے ڈرایا جائے۔توہم پرستی، شک، ناواقفیت، جہالت، اور جاہلیت سے ٹکر لینے کے لیے ان کے ذہن کو علمی اور مذہبی بنایا جائے۔یہ کام بانی مجلس کو بھی کرنا ہے، ماتمی دستہ کے سکریٹری کو بھی کرنا ہے، ہر چھوٹے بڑے ذاکر کو بھی کرنا ہے۔ ہر رسالہ کے محرم نمبر کو بھی کرنا ہے، ہر حسینی شاعر کو بھی کرنا ہے۔بگڑے ایرانی سنبھل گئے۔کیا یہ بگڑے ہندوستانی نہیں سنبھل سکتے۔

اگر نہیں سنبھل سکتے تو کیوں؟ اگر سنبھل سکتے ہیں تو کب اور کیسے؟ کیا صرف سوچتے رہیں گے یا اٹھ کھڑے ہونے کا فیصلہ بھی کریں گے؟

مستقبل کی تعمیر ہمارے ہاتھ میں ہے

کسی کا مقولہ ہے کہ ایمانداری دیکھنا ہے تو لاکھوں، ہزاروں اور سینکڑوں میں نہ دیکھو۔ بلکہ پیسوں میں دیکھو۔اس لئے کہ ہر شخص سماجی بدنامی سے بہر حال ڈرتا ہے لہٰذا الگ الگ حالات کی بنا پر کوئی لاکھ کوئی ہزار کوئی سو روپیہ کی بے ایمانی کرتے ڈرتا ہے کہ بدنام ہوجائے گا۔لیکن واقعی ایمان دار وہ ہے جسے سماج کا خوف نہ ہو بلکہ خدا کا خوف ہو اور ایسا شخص ایک پیسہ کی بھی بے ایمانی نہیں کرسکتا۔مولائے کائنات حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے دو آدمی ملنے کے لیے آئے۔انہوں نے سماج اور حکومت میں اپنی امتیازی جگہ بڑی جانفشانی سے بنائی تھی۔اور مولائے کائنات کی عادل حکومت میں ان کو اپنی سماجی برتری کے بے نشان ہونے کا سخت خطرہ لاحق تھا۔وہ علیؑ سے اپنے سیاسی اور سماجی مستقبل کے بارے میں بارے کرنے آئے تھے۔رات کے اندھیرے میں ملاقات کو اس لئے موزوں قرار دیا تھا کہ اس طرح کوئی ان کو آتے جاتے بھی نہ دیکھے گا اور تنہائی میں وہ اپنا مقصد ہر طرح پیش کرسکیں گے۔ممکن ہے ان کو یہ امید بھی رہی ہو کہ اندھیرے اور تنہائی میں شاید علیؑ غیر مطمئن حالات کی بنا پر اپنے بے لچک عادلانہ مزاج میں لچک پیدا کرسکیں۔اسی لچک کے سہارے وہ اپنے ماضی کو مستقبل میں محفوظ کرنے کی امید رکھتے تھے اور اسی کوشش کے لیے آئے تھے۔حسن اتفاق کہ مولا علیؑ اسی وقت بیت المال کا حساب لکھ رہے تھے۔ جیسے ہی رجسٹر بند کیا۔ چراغ بھی بجھا دیا۔

دونوں نے حیرت زدہ ہوکر سوال کیا کہ ملاقات کا یہ کون سا نیا طریقہ ہے۔ مولٰی نے جواب دیا کہ چراغ میں بیت المال کا تیل تھا۔ حساب بھی بیت المال کا تھا۔ جب کام ختم ہوا تو بیت المال کا تیل ناجائز کیونکر جل سکتا تھا۔ البتہ آپ کو روشنی درکار ہے تو میں گھر سے چراغ منگاتا ہوں اور امام حسن علیہ السلام آپ کے فرماتے ہی چراغ لے آئے۔ اس کے بعد دونوں نے عرض حال کے بجائے بغاوت کرنا طے کیا۔ اور مسلمانوں میں بصرہ کے میدان میں ان ہی کے باعث خوفناک جنگ ہوئی اور اگر فتح علیؑ کی نہ ہوتی تو مسلمانوں کے جان و مال کے نقصان میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ مگر فاتح مکہ رسولؐ کے جانشین نے فاتح فوج کو ہر طرح سے مالی اور جانی و جاہی نقصان پہنچانے سے روک دیا۔ اور حتمی فیصلہ سنا دیا کہ فتنہ وفساد روکنے کے لیے جنگ تھی نہ کہ دشمن کو نیست و نابود کرنے کے لیے اور نہ انتقامی کارروائی کرنے کے لیے تھی۔ فتنہ سرد ہو گیا۔ فساد بظاہر رک گیا لہٰذا فوجی اقدام یعنی جہاد کا محل نہیں رہا۔ شاید مکہ سے بصرہ زیادہ مشکل موقع تھا۔ مکہ میں خود رسول اکرمؐ کو اپنے دشمنوں کو معاف کرنا تھا اور بصرہ میں مجاہدین کو قابو میں رکھنا تھا۔

اس واقعہ سے واضح ہے کہ مولائے کائنات کا ماننے والا وہی ہو سکتا ہے جو ذرہ برابر بھی بے ایمانی نہ کرے اور سب سے بڑی بے ایمانی ہے خالق کی نافرمانی۔ اگر دنیا میں حکومت کی نافرمانی، والدین کی نافرمانی، محسن کی نافرمانی وغیرہ بڑی بے انصافیاں اور بے ایمانیاں ہیں تو خدا کی نافرمانی جو خدا بھی ہے، خالق بھی ہے، رب بھی ہے، حاکم بھی ہے، محسن بھی ہے سب سے بڑی نافرمانی ہوگی اور سب سے بڑی بے انصافی اور سب سے بڑی بے ایمانی ہوگی۔ اسی لیے اس نے قرآن مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے مگر شرک ناقابل معافی ہے اور احکام خدا کی خلاف ورزی انسان کو

پوشیدہ شرک تک پہنچا دیتی ہے۔ خصوصاً مسلسل نافرمانی اور بڑی سے بڑی نافرمانی پر بھی نہ شرمندہ ہونا نہ افسوس کرنا، اسی لیے معصومؑ نے اعلان کیا کہ ہماری شفاعت اس کو نہیں مل سکتی جو نماز کو ہلکا سمجھے اور یہ بھی وضاحت کی کہ مسلسل ترک نماز اس کو سبک ہی سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ اگر اپنی عاقبت بچانا چاہتے ہیں تو سوائے توبہ کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور توبہ کا مطلب ہے کئے پر خوفزدہ ہونا۔ معافی کے لیے بیتاب ہونا اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پکا ارادہ ہونے اور معافی حاصل کرنے کے لیے مسلسل خدا کو زبان و عمل سے آئندہ گناہ نہ کرنے کی یقین دہانی کرانا ہے۔ کیونکہ مجرم کو معافی کی التجا کا حق ہے۔ معاف کرنا مالک کا حق ہے لہٰذا اس کو اپنے عمل سے راضی کرنا ہوگا تا کہ وہ معاف کر دے۔

مگر آج کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور پرورش پائی ہے جہاں سماجی خوف تھا۔ حکومتی خوف تھا، مالی خوف تھا مگر نہ الٰہی خوف تھا۔ نہ ہم نے یہ جانا تھا کہ حضرات معصومین علیہم السلام کس قدر خدا کی نافرمانی پر غضبناک ہوتے ہیں۔ جب ان کی ناراضگی کا علم نہ تھا تو خوف معصومین علیہم السلام بھی نہ تھا۔ لیکن آج ہر طرف تحریر وتقریر کے ذریعہ سونے والوں کو بیدار کیا جارہا ہے۔ اسلامی انقلاب پابندی دین کی دعوت دے رہا ہے۔ وقت ظہور روز بروز قریب ہو کر امامؑ کے سامنے حاضر ہونے کی تیاری کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ گھروں میں توضیح المسائل پڑھی جارہی ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں بھی دینی واقفیت کی طرف متوجہ ہو رہی ہیں۔ جوان اور نوجوان غیر مذہبی بلکہ مذہب دشمن سماج کے خلاف بغاوت پر تیار ہو رہے ہیں۔ یہ سب کرشمہ سازی ہے پس پردہ غیبت سے آنے والی اس آواز کا جو دوستوں کے دلوں کو سنائی دے رہی ہے کہ اگر تم ہمارے ظہور کے لیے تیار ہو جاؤ تو ہم ظہور کے لیے تیار ہو کر مالک

کی بارگاہ میں ظہور کی درخواست کریں۔ ایسے میں لازم ہے، ضروری ہے، واجب ہے کہ دینی تعلیم، دینی تبلیغ، دینی لٹریچر، دینی ماحول پیدا کرنے میں ہم سب مل کر انتھک کوشش کریں۔ ورنہ جہاں ایرانی مسلمان اس وقت اپنے امام کی خدمت میں سرخرو ہو کر حاضر ہو رہے ہیں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو قبر میں امام کا سامنا کرنے اور نظر اٹھانے کی ہمت نہ ہوگی۔ ابھی مستقبل کی تعمیر ہمارے ہاتھ میں ہے۔ کائنات کا مستقبل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہدایت کا مستقبل امام زمانہؑ کے ہاتھ میں ہیں۔ ہماری دنیاوی زندگی کا مستقبل بھی خدا کے ہاتھ میں ہے کیونکہ ہم صرف تدبیر کر سکتے ہیں لیکن تدبیر کا کارگر ہونا ضروری نہیں ہے۔ سعی ہماری ہوتی ہے۔ تکمیل خدا کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن ہماری دینی زندگی کا مستقبل سو فیصدی ہمارے ہاتھ میں ہے ہم اسے بگاڑ کر دوزخ میں اور بنا کر جنت میں جا سکتے ہیں عقل خدا نے دی۔ ہدایت انبیاء اور ائمہ علیہم السلام نے کی۔ اب ہدایت قبول کرنا اس کے مطابق عمل کرنا، دین کو جاننا، معرفت میں اضافہ کرنا۔ اعلم فقیہ سے واجبات معلوم کر کے ایک ایک واجب کو ادا کرنا اور محرمات کو معلوم کر کے ایک ایک گناہ سے اپنے کو بچانا صرف ہمارے ہاتھ میں ہے۔

بے شک کوشش کے باوجود لغزش ہو جائے گی۔ جس کے لیے توبہ کا دروازہ موت کے دروازہ کے کھلنے تک کھلا رہتا ہے۔ توبہ ایسی قسمت ساز اور مستقبل ساز ہے کہ حرؑ کو حبیب کا درجہ دلا دیتی ہے۔ مگر توبہ یعنی کئے پر شرمندگی، معافی کی طلب، اور نہ معاف ہونے کی گھبراہٹ کی بنا پر گڑگڑانا اور آئندہ گناہ سے بچنے کا عزم محکم توبہ ہے۔ توبہ اور گناہ توبہ کا مذاق ہے اور خدا کی توہین کرنا ہے۔ ہماری کوشش کے بعد ہماری ہمت افزائی کے اسباب خدا اور رسولؐ و امام کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں۔

قومی اندازفکر میں اصلاح وتوسیع کی ضرورت ہے

تنظیم المکاتب ایک دینی تعلیمی تحریک ہے اور دینی تعلیمی تحریک اسلامی انقلاب کا ایک جز ہے۔ اسلامی انقلاب کا مطلب ہر مسلمان کا واقف دین ہونا اور پابند دین ہونا ہے۔ پابندی دین کا مطلب جزوی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ ایسی ہمہ گیر پابندی ہے جو زندگی کو ہر وقت حدود دین میں رکھے۔ تعلیم، ملازمت، کاروبار، صنعت، زراعت، شادی، غمی، تعمیرات، تقریبات غرضکہ ہر شعبہ زندگی، ہر مرحلہ زندگی، ہر لمحہ زندگی دین کے مطابق بسر ہو۔ اگر حکومت اور ماحول اسلامی ہو تو بھی زندگی اپنی تمام وسعتوں سمیت مذہب کی حد میں رہے اور اگر حکومت اور ماحول غیر اسلامی ہو تو بھی زندگی اپنی تمام پابندیوں اور زحمتوں سمیت ان حدود میں رہے جو اسلام نے اس حالت و ماحول کے لیے فرد و جماعت کے لیے معین کئے ہوں۔

قصہ مختصر یہ کہ ہمارے تمام اعمال اور افکار پابند حدود اسلام ہوں۔ بلکہ اعمال تو پابند افکار ہوتے ہیں لہٰذا ہمارے افکار کا اسلامی ہونا ضروری اور لازم ہے۔ افکار کی تعمیر میں تعلیم کو بھی دخل ہوتا ہے۔ ماحول بھی ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تمنائیں اور آرزوئیں بھی اس کے رخ کو تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم ایسی ہو جو

اسلامی ذہن پیدا کرے۔ ہمارا ماحول ایسا ہو جو ہماری فکر کو اسلامی رکھے۔ ہماری آرزوئیں تمنائیں، خواہشیں اسلامی ہوں تاکہ اسلامی فکر کا رخ تبدیل نہ ہو سکے۔ یہ ایک بڑا کام ہے اور مشکل کام ہے۔ اور بہت نازک کام ہے۔ اس کام کے لیے محنت، لگن، عقل وعلم، ذہانت وفراست، تجربہ وتجزیہ، احساسات کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنظیم المکاتب کے خدمت گذار، مکاتب کے ذریعہ تحریر کے ذریعہ تقریر کے ذریعہ اجتماعات کے ذریعہ نجی نشستوں کے ذریعہ اپنی بساط بھر اسلامی انقلاب اور دینی تعلیمی تحریک کے لیے کوشاں ہیں اور خداوند عالم کامیابی بھی دے رہا ہے۔ اس کی بارگاہ میں ہماری دعا ہے کہ ہمارے توفیقات میں برابر اضافہ فرماتا ہے اور ہم کو غلطیوں اور لغزشوں سے محفوظ رکھے۔

علماء کرام سے بھی گذارش ہے کہ ہماری رہبری فرماتے رہیں۔ ہماری غلطیوں پر متنبہ فرماتے رہیں تاکہ ہم اپنے اقدامات کی اصلاح کرتے رہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ قوم کو دین سے باخبر کرنے اور پابند دین بنانے کی ذمہ داری سب پر عائد ہوتی ہے لہٰذا تمام علماء وذاکرین وائمہ جماعت اور سربراہان دینی تعلیم کا فریضہ ہے کہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اسلامی انقلاب و دینی تعلیمی تحریک کو فروغ دینے میں حصہ لیں۔ ورنہ کل ہم کو آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ دینی پابندی کی کمی کا سب سے بڑا سبب قوم کا غیر اسلامی انداز فکر ہے۔ ہم سب کو مل کر قوم کے انداز فکر کو اسلامی بنانے کی کوشش کرنا چاہئے موجودہ انداز فکر میں اصلاح کی بھی ضرورت ہے اور توسیع کی بھی ضرورت ہے۔

مثال کے طور پر جزوی پابندی دین کافی ہے۔ یہ وہ تصور ہے جو آج قوم کے ۸۰۔۹۰ فیصدی افراد کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں صرف عقائد کا

درست ہونا کافی ہے۔ کچھ لوگ صرف محرم، رمضان، عید، بقرعید میں دینی امور کی انجام دہی کو کافی سمجھتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں دین کی راہ میں مال کا صرف کر دینا کافی ہے کچھ کا خیال ہے کہ جتنا ہو سکے جیسے ہو سکے اتنی دینی پابندی کرو باقی خدا بخشنے والا ہے۔ مولیٰ بخشوانے والے ہیں۔

کچھ کہتے ہیں ہم تو جاہل اور گنہگار ہیں جو بھی ہم سے ہو جائے گا خدا قبول کرلے گا۔ اس کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کو اس کی رحمت کی ضرورت ہے۔ اور اس کی رحمت تو بہر حال ہمارے گناہوں سے زیادہ ہے۔ کچھ فرماتے ہیں اگر ہم سب متقی اور پرہیزگار ہو جائیں گے تو پھر خدا کسکو بخشے گا۔ اسی طرح کے بہت سے غلط خیالات ہیں جن کا محور یہی ہے کہ جزوی پابندی دین کافی ہے۔ بعض عوام پسند حضرات ایسے غلط خیالات کی حمایت بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ حمایت زیر منبر بھی ہوتی ہے اور بالائے منبر بھی ہوتی ہے۔

پابندی دین سے جان چرانے والے افراد کے لیے یہ حمایت نہایت خوش گوار ہوتی ہے۔ لیکن یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں کی راحت، تن آسانی، شہرت، مقبولیت، سب فانی ہے۔ صرف عمل باقی رہنے والا ہے۔ اس کے اثرات برقرار رہنے والے ہیں۔ جزوی پابندی دین کے کافی ہونے کے لیے نہ کوئی آیت موجود ہے نہ کوئی حدیث پائی جاتی ہے نہ کسی عالم دین نے کبھی ایسا کوئی فتویٰ دیا ہے۔ رہے عوامی دلائل ان کی کوئی قیمت فقہ اور شریعت میں نہیں ہے۔ عوام تو خواب کو بھی دلیل بنا لیتے ہیں بلکہ اپنے تصورات کو دلیل بنا لیتے ہیں۔ اگر عوام کے خیالات کافی ہوتے تو دین کو بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ عوام کو دین طے کرنے کا اختیار دے دیا جاتا۔ شریعت اور فقہ کو معطل کرکے عوامی دلائل کی بنیا

دیر کچھ طے کر لینا خدا اور رسول وائمہ معصومین علیہم السلام کو ناراض وغضبناک کرنا ہے۔ ائمہ علیہم السلام نے ہم کو فقہا کے حوالے کیا ہے نہ کہ فقہا کو عوام کے حوالے کیا۔ لہٰذا انداز فکر کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔

اسلام میں کوئی چیز اکیلی کافی نہیں قرار دی گئی ہے۔ صرف اقرار توحید کافی نہیں ہے۔ نہ صرف اقرار نبوت یا امامت یا قیامت کافی نہیں ہے بلکہ سب کا اقرار ضروری ہے اور صرف اصول دین کا اقرار کافی نہیں ہے بلکہ فروع دین پر عمل بھی ضروری ہے۔ اصلاح فکر کے ساتھ توسیع فکر بھی ضروری اور مفید ہے۔ مثلاً مولائے کائنات امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ پوچھ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے درمیان نہ رہوں اور تم پوچھنے سے محروم رہ جاؤ۔ (سلونی قبل ان تفقدونی) ہم نے اس فقرہ پر ہمیشہ اس رخ سے سوچا کہ یہ فقرہ مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے غیر محدود علم کا مظہر ہے آپ کے علاوہ کسی کے یا تو ایسے دعویٰ کی ہمت نہیں کی یا اگر کسی نے ہمت کی تو وہ اسی وقت رسوا ہوا۔ مثلاً ایک دعویٰ کرنے والے سے پوچھا گیا کہ جناب آدمؑ کے حج کے موقع پر آپ کے سر کے بال کس نے مونڈے تھے۔ دوسرے دعویٰ کرنے والے سے سوال ہوا کہ جناب سلیمانؑ سے جس چیونٹی نے گفتگو کی تھی وہ نر تھی یا مادہ اور دونوں دعویدار رسوا اور ذلیل ہوئے۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام کے اس دعویٰ کا مذاق اڑانے کے لیے ایک شخص نے کہا کہ بتائیے میرے سر میں بال کتنے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں بالوں کی تعداد تو بتا دوں گا مگر اس کی تصدیق کیسے ہوگی۔ البتہ میں بتاتا ہوں کہ تیرا ایک فرزند پیدا ہوگا جو میرے فرزند حسین ابن علیؑ سے کربلا میں جنگ کرے گا۔

غرضکہ سارے تذکرہ صرف اسی خیال کے گرد جمع رہے کہ آپ کا علم غیر معمولی اور غیر محدود ہے کوئی شخص آپ کا مثل درکنار اس صفت کے کسی حقیر حصہ کا بھی مالک نہیں ہے۔ لیکن اس فقرہ میں ایک عظیم درد پوشیدہ ہے جس کی طرف ہم متوجہ نہ ہو سکے۔ وہ درد یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ امت آپ سے زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے تا کہ اسے میرے بعد علمی محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مولا علیؑ کس قدر بے چین ہیں کس قدر بیتاب ہیں کہ امت دین سے جاہل نہ رہ جائے۔ ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنے انداز فکر میں بھی توسیع کریں تا کہ ایسے مطالب بھی ہمارے ذہن میں آسکیں۔

غرضکہ قومی انداز فکر کی اصلاح وتوسیع کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی طرف متوجہ ہونا سب کا فریضہ ہے۔ ہر کوتاہی کرنے والے کو کل عتاب بلکہ عتاب کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ توسیع فکر کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ہم ابھی تک صرف محبت اہلبیت علیہم السلام کی طرف متوجہ رہے ہیں کیونکہ آپ حضرات کے دشمنوں نے شدید دشمنی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود یہ محبت نامکمل ہے جب تک محبت خدا ومحبت رسولؐ کی طرف بھی ہم بھرپور متوجہ نہ ہو جائیں۔

اسی طرح ہم غم حسینؑ کی طرف پورے طور پر متوجہ ہیں لیکن خود امام حسین علیہ السلام کو کون سا غم تھا جس نے کربلا کے عظیم وشدید مصائب برداشت کرنے کے لیے آپ کو آمادہ کیا تھا۔ ہم اس غم کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ حسینؑ کو صرف اور صرف یہ غم تھا کہ کوئی انسان، کوئی مسلمان، کوئی مومن، کوئی حسینی دوزخ میں نہ جانے پائے اگر ہم حسینؑ کے غم کو اپنا غم بنا لیں اور قوم کے انداز فکر کی اصلاح وتوسیع کی مہم میں لگ جائیں تو امامؑ کا غم آج کم ہو جائے گا اور ان کے غلاموں کا غم کل بروز قیامت مٹ جائے گا۔

توہم پرستی کے خلاف جہاد کیجئے

یقین، گمان، شک، وہم چار چیزیں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے کہ کسی چیز یا کسی بات کے ہونے یا نہ ہونے کے دونوں امکان ہوتے ہیں۔ اگر ہونے کا سو فیصدی علم حاصل ہوئے تو اس علم کا نام یقین ہے۔ اگر ہونے کا سو فیصدی علم نہ ہو مگر ۵۱ فیصدی یا اس سے زیادہ ہونے کا خیال ہو تو اس خیال کا نام گمان ہے۔ جس کی حد ۵۱ فیصدی سے ۹۹ فیصدی تک ہوگی۔ گمان کے مقابل کا نام وہم ہے جس کی حد ایک فیصدی سے ۴۹ فیصدی تک ہوگی۔ البتہ اگر ہونے نہ ہونے کا علم برابر ہو تو اس صورت حال کا نام شک ہے۔

مندرجہ بالا تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ وہم کمزور خیال کا نام ہے۔ جو قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ نے انسان کو جہاں بہت سی قوتیں دی ہیں ان میں سے ایک وقت واہمہ بھی ہے۔ جس کا کوئی وہم پیدا کرنا ہے۔ ناسمجھی ہوگی اگر ہم یہ خیال کریں کہ جب وہم ناقابل اعتماد چیز کا نام ہے تو خدا نے وہم پیدا کرنے والی قوت پیدا ہی کیوں کی۔ نہیں خدا نے ہر چیز کو ایک مفید مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ مگر اس کا غلط استعمال مضر ہوجاتا ہے۔ اس مضرت اور غلط استعمال کا ذمہ دار بندہ ہے نہ کہ خدا۔ حافظہ بڑی ضروری اور اچھی چیز ہے لیکن خدا نے حافظہ اور یادداشت کے مقابلہ میں نسیان اور بھولنے کی صلاحیت بھی انسان میں پیدا کی ہے اگر انسان میں بھولنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو

صاحبان غم اپنے غم کے ہاتھوں ہلاک ہوجاتے۔ لیکن فرائض کا بھول جانا۔ امانتوں کا بھول جانا وغیرہ بھولنے کا غلط استعمال ہے۔ جاگنا زندگی ہے لیکن اللہ نے نیند بھی پیدا کی ہے اگر نیند نہ ہو تو آدمی تھک کر ہلاک ہوجائے۔ نیند ضروری راحت اور ریلیف کے لیے ہے۔ البتہ زیادہ سونا جسم اور تمام کاموں کے لیے مضر ہوجائے گا جو نیند کا غلط استعمال ہے۔ اسی طرح اللہ نے قوت واہمہ اس لیے پیدا کی ہے کہ یہ انسان انجانے خطروں کی طرف متوجہ ہوجائے۔ رسی کے سانپ ہونے کا وہم جہاں ۹۹ فیصدی مہمل ہوتا ہے وہاں ایک فیصدی سا موذی سے بچنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے وہم انسان کو بہت سی باتوں کے جانچنے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جن کی طرف متوجہ نہ ہونا کبھی کبھی ہلاکت وتباہی اور دشمن کی کامیابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ غرضکہ وہم کبھی کبھی انجانے خطرات سے بچانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی مفید مقصد کے لیے خداوند عالم نے قوت واہمہ پیدا کی ہے۔ لیکن جس طرح انسانوں نے ہر مفید مقصد کے لیے پیدا ہونے والی چیز کا غلط استعمال کر کے مضر اور نقصان رساں چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے ہیں اسی طرح قوت واہمہ کا بھی غلط استعمال ہوا ہے۔ اور انسان نے بے شمار وہمی چیزیں مذہب میں، سماج میں، رواج میں۔ تہذیب میں شامل کردی ہیں۔ اور ان کو حقائق اور سچائیوں سے بھی بڑا رتبہ دے دیا ہے۔ بت پرستی صرف توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ توہم پرستی کا ایک سرا اگر بت پرستی سے تو دوسرا کنارہ ٹونے اور ٹوٹکے ہیں۔

اسلام توہم پرستی کا سخت اور شدید مخالف ہے۔ اس نے بت پرستی ے ڈھول کا خول واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ بتوں کے قبضہ میں نہ کوئی نفع ہے نہ کوئی نقصان یہ مکھی کو نہیں ہنکا سکتے تو کیا کر سکتے ہیں۔ مگر ماننے والوں کے خیال میں سارا نفع اور نقصان ان

کے راضی رہنے اور ناخوش ہونے میں ہے۔ اور انہوں نے راضی رکھنے کی باتیں بھی خود ہی طے کرلی ہیں اسی لیے کہ بت تو بت ہے وہ تو کچھ کہنے سے رہا۔ اس طرح خدا قبضہ میں رہتا ہے نہ کہ بندہ۔

اسلام نے تو ہم پرستی کے مقابلہ میں خدا پرستی کی تعلیم دی ہے کہ خدا ہی ہر نفع اور نقصان کا مالک ہے۔ اس کی ہر ہدایت پُر مصلحت وپُر حمت ہوتی ہے اگر چہ ہم اس کے کاموں اور حکموں کی بہت بڑی تعداد کی حکمت اور مصلحت سمجھنے سے اس لئے قاصر ہیں کہ ہمارے علم وعقل کو کوئی نسبت خدا کے علم سے نہیں ہے۔ نہ قطرے میں سمندر سما سکتا ہے نہ اس کی حکمت ومصلحت کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ جن کو اپنی کم مائیگی اور اللہ کے کمال کا احساس رہتا ہے وہ اپنے علم وعقل کو احکام خداوندی پر نچھاور کرنے ہی کو عقلمندی سمجھتے ہیں اور جو لوگ خود آگہی اور خدا آگہی دونوں سے کورے ہوتے ہیں ان کی جہالت ہر حکم خداوندی میں الجھاؤ پیدا کرتی رہتی ہے اور وہ اسی الجھاؤ کو اپنی علمی قابلیت اور عقلی صلاحیت سمجھتے رہتے ہیں۔

غرضکہ قدیم، قادر، عالم، حکیم، عادل خدا نے ہم کو اپنے فرمان یعنی قرآن مجید کے ذریعہ اور اپنے عہدہ داران نبیؐ وامامؑ کے ذریعہ یہ بات ہم پر واضح کردی ہے کہ نفع نقصان صرف خدا کے قبضہ میں ہے۔ اور نفع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں ایک ایمان، دوسرے اعمال صالح۔ تیرے نبی وامامؑ کا وسیلہ چاہنا۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی کم ہوگی تو ہم نہ نفع حاصل کرسکیں گے اور نہ نقصان سے بچ سکیں گے۔ یہ بات بار بار سمجھ لینا چاہئے کہ نفع ونقصان صرف خدا کے قبضہ میں ہے۔ جو صرف نبیؐ وامامؑ کے وسیلہ سے حاصل ہوگا۔ اور حاصل کرنے کے لیے ایمان اور

نیک اعمال ضروری ہیں۔ نیک اعمال صرف وہی ہیں جن کا حکم خدا، نبیؐ، امامؑ نے دیا ہے۔ اس کے علاوہ جتنی ہماری ایجادیں ہیں وہ سب ہمارے توہمات ہیں جن کی کوئی جگہ نہ مذہب میں ہے نہ ان کا کوئی فائدہ ہے۔ البتہ ہماری ایجاد دنیا وآخرت دونوں جگہ ہم کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ وہ ہیں جو زندہ یا مردہ پیر یا فقیر کو نفع نقصان کا مالک سمجھتے ہیں۔ ہم میں بعض وہ کمزور ذہن رکھنے والے بھی ہیں جو ایک نہیں بارہ بلکہ چودہ مشکل کشا رکھنے کے باوجود عاملوں اور مالوں کے پاس حل مشکلات کے لیے جاتے ہیں حد ہوگئی کہ خدا، نبیؐ، امامؑ کے سامنے والے منکرین خدا و نبیؐ وامامؑ کے پاس گنڈے، نقش، لوبان، راکھ، پانی اور نہ معلوم کیا خاک بلا لینے پہنچ جاتے ہیں۔ کتنے ہیں جو کسی جگہ کو کسی درخت کو یا کسی دوسری چیز کو متبرک سمجھ بیٹھے ہیں۔

ہماری توہم پرستی کی اسی کمزوری کو بھانپ کر بہت سے ملا، مولوی، مجاور طرح طرح سے لوٹتے ہیں اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ عوام بالکل دین سے جاہل ہیں۔ جس حال میں ہیں بس اسی حال میں رکھے جائیں ورنہ وہ ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے۔

اگر توہم پرستی صرف غیروں میں ہوتی تو ہم صبر کرلیتے لیکن جب توہم پرستی نت نئے طریقوں سے ہم میں داخل ہوگئی ہے اور اس کا مزید داخلہ جاری ہے تو ہم سب پر لازم ہے کہ توہم پرستی کے خلاف جہاد کریں اور جہاد صرف یہی ہے کہ عوام تک علم دین کی توسیع کیا جائے۔ ان کو ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال کیا جائے۔

جس کی سب سے پہلی منزل یہ ہے کہ گود سے مدرسہ تک اور مسجد سے منبر تک علم دین کی تعلیم اتنی عام کی جائے عوام سننے کے بعد مذہبی کتابیں خود بھی پڑھنے لگیں۔ تو ہم پرستی کا سبب صرف جہالت ہے اور اس کا توڑ صرف تعلیم دین کی توسیع ہے۔

استخارہ

ہمارے درمیان جو دینی بحثیں ہوا کرتی ہیں ان کا ایک نمایاں موضوع استخارہ بھی ہے۔ مذہب کا مذاق اڑانے والے اکثر استخارہ کا بھی مذاق اڑاتے ہیں۔ اور مذہب کی پابندی کرنے والوں میں بعض ہر قدم پر استخارہ دیکھتے ہیں کہ ہر کام سے پہلے استخارہ اور ہر استخارہ کے بعد استخارہ یہاں تک کہ یا کام ختم ہوجائے یا استخاروں کا اتنا انبار ہوجائے کہ فیصلہ استخارہ کے بوجھ تلے دب جائے۔

بعض حضرات دین کے کسی حکم کی پابندی نہیں کرتے۔ ہر حرام میں آزاد ہیں۔ ہر واجب ترک کرنے میں جری ہیں انہوں نے دین میں صرف ''استخارہ'' لے لیا ہے۔ چنانچہ ضرور دکھائیں گے اور اس پر ضرور عمل کریں گے۔

قوم میں استخارہ بعض امور میں ہر واجب سے زیادہ واجب ہے مثلاً شادی کے موقع پر، جائداد کی خریداری کے موقع پر چنانچہ بعض حضرات صرف استخارہ پر فیصلہ کرتے ہیں۔ مسئلہ کے پیش و پس پر نظر ہی نہیں کرتے۔

بعض حضرات کے یہاں استخارہ دیکھنے والے حضرات معین ہیں۔ ان کو اور ان کے خاندان کو کسی کا دیکھا ہوا استخارہ مطمئن نہیں کرتا۔ جب تک ان کے ''جناب'' استخارہ نہ دیکھ دیں اور جناب کا جناب ہونا بس استخارہ دکھائے سے ثابت ہوتا ہے ورنہ جناب سے کبھی کوئی دینی مسئلہ دریافت نہیں ہوتا شاید معتقدین کے خیال میں ان کے جناب

سے اور خدا سے خصوصی رابطہ ہے۔

کچھ لوگ حسب مرضی استخارہ کے خواہش مند ہوتے ہیں لہٰذا مقید اور مطلق استخارے ہوتے ہیں اور جب تک استخارہ حسب مرضی نہ ہوجائے تب تک دیکھا جاتا رہتا ہے۔ یہ استخارہ آیا نہیں ہے بلکہ لایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی رائے بدلنے کے بعد استخارہ کا رخ کیسے بدلا جائے اس کے لیے مشورے ہوتے ہیں اور ایسے مولوی صاحب کی تلاش ہوتی ہے جو استخارہ بدل سکیں۔ ایسے موقع پر تاریخ دار استخارہ ہوتے ہیں ہر نام میں عرفیت ولدیت وغیرہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

بعض حضرات استخارہ دکھلانا خلاف علم و عقل سمجھتے ہیں۔ ان کے فقرے اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ہم نے تو آج تک استخارہ دیکھا ہی نہیں۔ یعنی گویا وہ اس بری بات، کم عقلی اور بے عقلی سے محفوظ رہے استخارہ ہی وہ کام ہے جسے اکثر مومنین خود نہیں کرتے بلکہ اسی موقع پر کسی مولوی کی تلاش ہوتی ہے اور اگر مولوی نہ ملے تو کسی نمازی اور متقی شخص کی عزت افزائی ہوتی ہے۔

شریعت کے لاکھوں واجبات پر عمل نہ کرنے والے خدا، رسولؐ، امامؑ اور عذاب دوزخ سے نہیں ڈرتے کیونکہ عذاب کا خطرہ آخرت میں ہوگا۔ اور آخرت پر یا یقین نہیں ہے یا فی الحال مصروف زندگی میں اس پر غور کرنے کی ضرورت و فرصت نہیں ہے۔ البتہ استخارہ پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے یہ حضرات سخت پریشان اور متفکر نظر آتے ہیں کیونکہ خطرہ ہوتا ہے کہ استخارہ پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے کوئی نقصان ہوجائے یا کوئی نفع چھوٹ جائے یا کوئی بلا نازل ہوجائے اور چونکہ ان تمام امور کا تعلق دنیا سے ہے لہٰذا اس خطرہ کی طرف فوراً ملتفت ہونا ضروری ہے۔

کچھ لوگوں کے خیال میں استخارہ سے علم غیب حاصل ہوسکتا ہے لہٰذا وہ استخارہ دکھانے آتے ہیں۔ مثلاً بھینس کھوگئی ہے کہاں ملے گی۔ لڑکا کھوگیا کہاں ملے گا۔ ایسے لوگ استخارہ کے بعد اگر نقصان ہوجائے تو دین پر نظر ثانی کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔

دینی ناواقفیت کی حد یہ ہے کہ حرام کام ہر حال میں حرام ہے۔ استخارہ کے بغیر بھی اور استخارہ کے بعد بھی حرام ہے بلکہ اس کے لیے استخارہ دیکھا بھی حرام ہے مگر وہ امور حرام کے لیے استخارہ دکھاتے ہیں اور مولوی استخارہ دیکھنے میں تامل نہ کرے اس لئے محتاط راستہ اختیار کرتے ہیں کہ میری نیت پر استخارہ دیکھ دیں۔ اسی طرح بعض حضرات ترک واجب پر استخارہ دیکھتے ہیں مثلاً روزہ رکھیں یا نہ رکھیں حالانکہ استخارہ منع آنے پر بھی روزہ واجب ہے اور اگر کسی وجہ سے روزہ حرام ہے تو استخارہ کے بعد بھی حرام ہے۔ مثلاً مرض میں، سفر میں۔

بعض لوگ نیت کو اتنی تفصیل بناتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو خطرہ ہے کہ کہیں معاذ اللہ خدا مسئلہ سمجھے بغیر رائے نہ دیدے۔

اب تک استخارہ کا سماجی تذکرہ تھا۔ آیئے اب ہم استخارہ کا عقلی، علمی، شرعی پہلو پر بھی غور کریں۔ استخارہ کے لفظی معنی ''بھلائی طلب کرنا'' اور اصطلاحی معنیٰ میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے لیے خدا کی رائے معلوم کرنا تا کہ خیر و برکت کی راہ معلوم ہوجائے۔ کوئی عقلی دلیل استخارہ کو مہمل ثابت نہیں کرتی۔ غلط مواقع پر یا غلط طور پر استخارہ دیکھنے والوں کی غلطی استخارہ کو غلط کام ثابت نہیں کرسکتی۔ جناب مریم کی پرورش کے مسئلہ میں قرعہ اندازی اور اس میں جناب زکریا جیسے نبیؑ کی شرکت دلیل ہے کہ خدا کی رائے معلوم کرنا ایک شرعی کام ہے۔

استخارہ کے موضوع پر بحمدہ مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ استخارہ کبھی غیبی خبر ثابت ہوتا ہے۔ خود میری زندگی میں ایسے بہت سے واقعات ہیں مثلاً ایک بار مجھ کو پنجاب میل سے لدھیانہ جانا تھا مالیر کوٹلہ میں عشرہ چہلم کی مجلسیں پڑھنا تھیں۔ میرا وطن بجنور چار باغ اسٹیشن لکھنؤ سے تقریباً ۱۱ کیلومیٹر پر ہے۔ سخت لو میں چلنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ استخارہ بار بار جانے کو واجب آرہا تھا۔ یہاں تک میں وطن سے اس وقت چلا جب پنجاب میل کے چھوٹنے کا وقت ہو چکا تھا۔ اور یہ سمجھ کر چلا کہ گاڑی تو نہیں ملے گی مگر شاید کوئی اور کام ہے۔ جس کی طرف استخارہ رہبری کررہا ہے۔ لیکن جب میں تقریباً ۳۰۔۱ر بجے سفر کر کے اسٹیشن پہنچا تو پنجاب میل اتنا لیٹ تھا کہ ٹکٹ لے کر اسٹیشن پر مجھے انتظار کرنا پڑا۔ یہ واقعہ استخارہ کی صحت، قوت کے ساتھ ساتھ وجود خدا کو بھی پوری قوت سے ثابت کرتا ہے اور اس اصول بھی ثابت کرتا ہے کہ خداوند عالم جسے اپنے بھیجے ہوئے ہادیوں کو غیب کی اطلاعیں دے سکتا ہے۔

ایک دوسرا واقعہ اس سے بھی عجیب ہے مجھے محمود آباد مجلس پڑھنے جانا تھا۔ قیصر باغ لکھنؤ بس اسٹیشن پر وطن سے آ کر معلوم ہوا کہ بس بعد مغرب جائے گی۔ لگ بھگ ۱۰ر بجے پہنچے گی۔ سوچا جانا بے کار ہے مومنین منتشر ہوجائیں گے۔ استخارہ دیکھا کہ اس بس سے محمود آباد جاؤں منع آیا۔ وطن واپس جاؤں منع آیا۔ لکھنؤ کی قیام گاہ پر چلا جاؤں منع آیا۔ عالم حیرانی میں بیٹھا تھا کہ کیا کروں استخارہ نے ہر راہ بند کردی ہے۔ ذہن میں خیال آیا کہ ممکن ہے محمود آباد ہاؤس سے کوئی کار محمود آباد جارہی ہو جس سے جلد پہنچنا ممکن ہوجائے۔ اس خیال سے محمود آباد ہاؤس آیا کوئی کار نہیں جارہی تھی۔ البتہ سیتا پور کے قاضی محمد طاہر صاحب مرحوم ایڈوکیٹ کئی دن سے میرے منتظر تھے۔ دوسرے دن صبح ان

کو واپس جانا تھا مجھے بھی ان کا انتظار تھا۔کام ضروری تھا۔بس اس طرح ان سے ملاقات ہوگئی۔کام مکمل ہوگیا۔اس کے بعد جس بس سے استخارہ منع آیا۔اس سے کچھ لوگ جارہے تھے۔قاضی صاحب مرحوم نے اصرار کیا کہ میں بھی چلا جاؤں۔استخارہ دیکھا آگیا۔محمود آباد پہنچا۔مومنین خلاف توقع منتظر موجود تھے۔میرے لئے یہ واقعات نہیں حقائق نہیں البتہ پڑھنے والوں کے لیے روایت ہیں لیکن ہر واقعہ دوسرے کے لیے روایت بن ہی جاتا ہے۔

میری زندگی میں ایسے بھی بہت سے استخارہ آئے۔جن پر عمل کرنے کے بعد متوقع نفع کے بجائے نقصان ہوا۔کبھی عرصہ کے بعد واضح ہوا کہ اس نقصان کے ذریعہ دوسرے بڑے نقصان سے بچے۔یا کسی دوسرے نفع تک پہنچے۔کبھی ایسا ہوا کہ کوئی نفع سامنے نہیں آیا مگر دل کو آج بھی اطمینان ہے کہ ثواب بہر حال ملا۔اور یہ بھی یقین ہے اس نقصان یں بھی ہمارا کوئی نفع ہی تھا۔جو ہمیں نہیں معلوم ہوسکا کیونکہ کوئی شریف کسی کو غلط رائے نہیں دے سکتا تو خدا کیسے غلط رائے دے سکتا ہے۔البتہ ہمارا علم اس کے علم کو نہیں چھوسکتا۔لہٰذا ایمان نفع ،نقصان ہر حال میں برقرار ہے۔

استخارہ دیکھنے کے مواقع پر یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ کام چھوٹے سے چھوٹا ہو یا بڑے سے بڑا ہو اگر دو رائیں پیدا ہوتی ہیں تو استخارہ کا محل ہے ورنہ اگر ایک ہی رائے پیدا ہوتی ہے تو استخارہ کا محل ہی نہیں ہے مثلاً روزانہ حاضری دینے والے کو فیکٹری، دفتر، کالج جانے کے لیے استخارہ دیکھنے کا محل اور موقع نہیں ہے۔جب تک کوئی تذبذب پیدا کرنے والی وجہ نہ پیدا ہوجائے۔مثلاً اسٹرائک ہوگئی تو جانے نہ جانے دونوں میں خطرہ ہے۔لہٰذا استخارہ کا محل پیدا ہوجائے گا۔ہم ایک آدمی کے منتظر ہیں۔اس کو آنے

میں دیر ہوگئی ہے۔ہمیں بھی جانے کی جلدی ہے۔اس کے آنے کے دو راستے ہیں۔اور ہم دونوں راستوں سے اپنی منزل پر جاسکتے ہیں۔اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ کس راستے سے آئے گا لہٰذا اگر یہ بہت چھوٹا سا معاملہ ہے مگر استخارہ دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک بار استخارہ کے بعد دوسرا استخارہ اسی وقت دیکھا جاسکتا ہے جب صورت حال میں کوئی تبدیلی ہوتی ہو۔مثلاً میں نے اپنے محمود آباد جانے کے جس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اس میں چونکہ قاضی صاحب سے ملاقات ہوچکی تھی جو اگر پہلے استخارہ منع نہ آتا تو نہ ہوتی لہٰذا دوبارہ اس بس سے جانے کا استخارہ دیکھنے کا محل آگیا تھا۔جس پر عمل کیا اور مجلس وملاقات دونوں کام ہوگئے۔اس واقعہ سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی جو ہدایت استخارہ سے ملی وہ ہدایت وقت وحالات کے پیش نظر محدود وقت وحالات کے لیے ہوتی ہے ایسے سارے مواقع پر صورت حال کے بارے میں فیصلہ کرنا، ہماری عقل پر منحصر ہے۔ہمارے فیصلہ کی غلطی سے استخارہ کے دامن پر دھبہ نہیں آسکتا ہے۔استخارہ کے مخالف اکثر یہ بات کہتے ہیں کہ استخارہ میں ہاں یا نہیں میں سے کوئی ایک تو آئے گا ہی لہٰذا بیکار ہے استخارہ دیکھنا۔لیکن بیماری جائے گی یا نہ جائے گی لہٰذا بیکار ہے علاج کرنا۔یا فیل ہوں گے یا پاس لہٰذا بیکار ہے پڑھنا۔یا نوکری ملے گی یا نہ ملے گی لہٰذا بیکار ہے کوشش۔پانی برسے گا یا نہیں برسے گا لہٰذا کھیتی کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ان میں سے کسی بات پر ہم میں سے کوئی نہیں راضی تو ہم استخارہ نہ دیکھنے پر کیوں راضی ہوجائیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ استخارہ سے قوت عمل کمزور ہوجاتی ہے۔قوت فیصلہ شل ہوجاتی ہے مگر یہ بے محل بے ضرورت استخارہ دیکھنے والوں کی غلطی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔

استخارہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ جب قوت فیصلہ کمزور ہو قوت عمل مضمحل ہو۔ ذہن تذبذب کا شکار ہو تو استخارہ اس کی دستگیری کرتا ہے۔ تذبذب اضمحلال کو دور کرتا ہے اور قوت عمل کو قوی کرتا ہے۔ زیادہ دوا کا استعمال یا غلط دوا کا استعمال دوا کے دوا ہونے پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

تسبیح اور ذات الرقاع کے استخارہ میں خدا کی خالص رائے معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن مجید کے استخارہ میں استخارہ دیکھنے والا اپنی رائے کے مطابق بتاتا ہے کہ خدا کی کیا رائے ہے استخارہ سجادیہ کی سندی حیثیت سے قطع نظر وہاں بھی حاصل ہونے والی رائے کو خدا کی خالص رائے نہیں کہی جا سکتا۔ درحقیقت یہ تفاؤل ہے۔ تفاؤل کا عادی ہونا مضر ہے مفید نہیں ہے۔ ذیل میں تسبیح استخارے کی ترکیب لکھی جاتی ہے تاکہ ہر شخص خود استخارہ دیکھ سکے۔ صاحب معاملہ جس توجہ سے خدا سے رائے طلب کرے گا اس توجہ کی دوسرے استخارہ دیکھنے والے سے امید نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اگر ذہن غیر معمولی طور پر پریشان ہو تو دوسرے سے استخارہ دکھانا زیادہ بہتر ہوگا۔

اگر کام کرنے کا استخارہ آجائے تو اس کو بہتر کہتے ہیں۔ اگر دوبارہ اس کام کے نہ کرنے کے لیے بھی استخارہ دیکھا جائے اور نہ کرنے کو منع آئے تو اس استخارہ کو واجب کہتے ہیں یعنی خدا کی رائے ہے کہ یہ کام ضرور کرو مگر واجب استخارہ پر عمل شرعاً واجب نہیں ہے کہ عمل نہ کرنے والا گناہ گار ہوگا۔ بلکہ عمل نہ کرنے والا اس فائدہ سے محروم رہے گا استخارہ جس کی طرف رہبری کر رہا ہے۔ اگر کام نہ کرنے کے لیے بھی استخارہ آجائے تو اس کو مساوی کہتے ہیں یعنی کرنا نہ کرنا دونوں مناسب ہیں اگرچہ اس موقع پر اس کام کو نہ کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

تسبیح کا استخارہ دو طرح دیکھا جاتا ہے۔

(۱) کام کی نیت کر کے ۳ بار صلوات پڑھے اور تسبیح کے کسی دانے کو پکڑ لے۔ اس کے بعد ۲۔۲ کر کے گنتا جائے آخر میں اگر ایک دانہ بچے تو ہاں سمجھے اور اگر دو دانے بچیں یعنی کچھ نہ بچے تو نہیں سمجھے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ۳/ بار صلوات پڑھ کر ۳/ بار استخیر اللہ برحمتہ خیرۃً فی عافیۃ۔ پڑھے پھر تین بار صلوات پڑھ کر تسبیح کے دانوں کو مندرجہ بالا طریقے سے گنے اور فیصلہ کرے۔

بہترین استخارہ ذات الرقاع کا ہے۔ جس کی ترکیب کتابوں میں دیکھی جائے۔

عورت اور ملازمت

سماج رواجوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ چونکہ ہر طبقہ میں الگ الگ رواج ہوتے ہیں لہٰذا الگ الگ سماج بھی ہوتے ہیں۔ رواج بدلے جائیں تو سماج بدل جاتے ہیں۔ لیکن عام آدمی رواج کی قیادت میں گرتے پڑتے لشتم پشتم چلتے رہے ہیں۔ دکھ اٹھاتے ہیں اور اس دکھ کو لازمی سمجھتے ہیں لہٰذا رواج کے خلاف نہ بولتے ہیں۔ نہ سوچتے ہیں بلکہ رواج کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سے بھی بڑا گناہ قرار دے کر اپنے کو رواج کا پابند رکھتے ہیں اور دوسروں کو بھی رواج کی جکڑ بند میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو رواج بھی پایا جاتا ہے اسے سب سے پہلے صرف کسی ایک آدمی سے شروع کیا تھا جس کو بعد میں لوگ رفتہ رفتہ اپنانے لگے پھر آہستہ آہستہ اس کی سماج پر گرفت مضبوط ہوگئی لہٰذا کسی رواج کی مخالفت بھی ابتدا میں کوئی ایک ہی آدمی کرے گا جو بتدریج بڑھتی جائے گی اور آخر الامر ایک نیا رواج پرانے رواج کی جگہ لے لے گا البتہ رواج کو بدلنا عام آدمیوں کا کام نہیں۔ عام آدمی تو رواج کے پیچھے چلنا جانتے ہیں۔ رواج بدلنا علما کا کام ہے دانشوروں کا کام ہے صاحبان زبان وقلم کا کام ہے۔ صحافی اور شاعر کا کام ہے۔ مصنف اور مقرر کا کام ہے جب تک یہ لوگ کسی رواج کا جائزہ نہیں لیتے۔ اس کے نفع نقصان کو محسوس نہیں کرتے۔ اس کے خلاف زبان وقلم کو حرکت میں نہیں لاتے اس وقت تک کوئی رواج نہ بدلا ہے نہ بدلے گا۔

آج کل لڑکیوں اور عورتوں کی ملازمت کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے ملازمت کرنے والیوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً جب تک شادی نہیں ہوتی لاؤ اس وقت تک ملازمت ہی کر لیں۔ چونکہ شادی نہیں ہوئی ہے لہٰذا ملازمت کر لی ہے اتنے دن پڑا ہے اس کا مصرف یہی ہے کہ ملازمت کر لی جائے۔ میاں بیوی دونوں کمائیں گے تو گھر بھر جائے گا لہٰذا ملازمت کے ہل میں دونوں جتے ہوئے ہیں۔ سسرال اور میکہ دونوں خوش حال اور لکھ پتی ہیں لیکن اونچی سوسائٹی میں عزت حاصل کرنے کے لیے ملازمت کرنا ضروری ہے۔

باپ۔ شوہر وغیرہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ گھر میں کوئی کمانے والا مرد موجود نہیں ہے۔ لہٰذا بیوہ یا لڑکیاں ملازمت کر رہی ہیں۔ گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ باپ کثیر العیال ہے۔ لڑکے نہیں ہیں یا چھوٹے ہیں لڑکیاں بڑی ہیں لہٰذا انہوں نے باپ کا بوجھ بٹانے کے لیے ملازمت کر لی ہے۔

غرضکہ ملازمت کرنے والی عورتوں اور لڑکیوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کچھ وہ ہیں جو بے ضرورت ملازمت کر رہی ہیں کچھ کو مالی حالات نے ملازمت پر مجبور کیا ہے۔ ملازمت کی وجہ کچھ بھی ہو پہلے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ عورتوں کی ملازمت میں نفع نقصان کا توازن کیا ہے۔ اور اس توازن کی بنا پر ملازمت اختیار کرنے کے قابل چیز ہے یا اس سے کنارہ کشی لازم ہے اس مرحلہ سے گذرنے کے بعد یہ بھی سوچنا ہوگا کہ جن غریب اور مجبور گھروں کے لیے ملازمت سہارا ان کے لئے ملازمت کا کوئی بدل ممکن ہے یا نہیں۔

ہم پہلے ملازمت کے نفع نقصان کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں مردوں کی ملازمت

میں بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تو عورتوں کی ملازمت میں کیا فائدہ نظر آئے گا البتہ نقصان ہی نقصان نظر آتا ہے۔ آج کل کے جنس زدہ ماحول میں عورت گھر سے باہر اپنے کو غیر محفوظ پاتی ہے۔ ملازمت کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہوگا۔ عدم تحفظ کا احساس ملازمت کیا زندگی کے سکون کو چھین لیتا ہے اور قلب و دماغ کو مستقل مبتلائے کرب رکھتا ہے۔

ملازمت کرنے والی عورتوں کے آنے جانے کے راستے اور اوقات معین ہوتے ہیں لہٰذا جنسی درندوں کے لیے ان کو ستانا آسان ہو جاتا ہے سڑکوں پر بسوں میں ریلوں میں جو کچھ ہوتے دیکھا ہے اور جو کچھ کہتے ہوئے سنا ہے اس سے سب کو اندازہ ہے کہ کس قدر بے حیائی کے جملے کسے جاتے ہیں اور عورتیں کس قدر بے چینی محسوس کرتی ہیں اور اگر عورتوں کے ساتھ ان کے شوہر، بھائی، باپ بھی ساتھ ہوتے ہیں تو ان کو بھی خون کے گھونٹ پیتے دیکھا ہے۔ کیا یہ کرب ملازمت چھوڑ دینے کے لیے کافی نہیں ہے لیجیے سفر طے ہو گیا۔ اسکول، کالج، آفس، اسپتال، فیکٹری میں عورتیں پہنچ گئیں لیکن یہاں بھی سکون نہیں ہے اگر عورت حیا کا ساتھ نہیں چھوڑتی تو اس کو ہر طرف للچائی ہوئی آنکھوں کے انگارے دکھائی دیتے ہیں۔ انگاروں کے درمیان زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی ہے یہ بات سب جانتے ہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بے حیائی اختیار کر لی تو ذہن کا بوجھ وقتی طور پر تو ہو جائے گا لیکن بے حیائی کے رشتے میں جڑے ہوئے دوست گناہوں کے اس سمندر میں کھینچ لے جاتے ہیں جہاں کنارہ ملتا ہی نہیں ہے۔

ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا گھروں کو واپسی ہوئی، ڈیوٹی، آنا، جانا تھکانے کے لیے کافی ہے اب تھکی عورت گھر کیا دیکھے عزیزوں، بچوں کی خبر کیا لے۔ خود نوکری کرے ملازم یا ملازمہ رکھے یا نہ رکھے اگر نہ رکھے تو کام کیسے چلے اگر رکھے تو ملازمت کا سارا

فائدہ ملازم کی تنخواہ اور اس کی چوری کے ذریعہ نہ صرف ختم ہو جاتا ہے بلکہ ملازم وہ پیر ہے جو گھر سے بھی کچھ لے جاتا ہے۔

ملازمت کرنے والی عورت کو بھی بہر حال دوسری عورتوں کی طرح بیوی اور ماں کے مراحل سے گذرنا ہوتا ہے۔ حمل و رضاعت کے فرائض بھی دینا ہوتے ہیں نسوانی زندگی فطری کلفتوں سے بھی گذرنا ہوتا ہے یہ تمام مراحل فرصت چاہتے ہیں، راحت کے مواقع بھی چاہتے ہیں۔ خلوت اور تنہائی کا تقاضہ کرتے ہیں مگر ملازمت کہاں موقع دیتی ہے۔

یہ چند اشارے ہیں ان نقصانات اور تکلیفوں کی طرف جو عورتوں کی ملازمت سے پیدا ہوتے ہیں البتہ جو مجبور مگر ملازمت کے لیے اپنے کو مجبور پاتے ہیں ان کے ملازمت کا بدل وہ گھریلو صنعتیں بن سکتی ہیں جن کو حکومت ہند فروغ دینا چاہتی ہے۔ اور جن کو اپنانے کی دعوت پیغمبر نسائیات جناب فاطمہ گھر میں اجرت پر اون کات کر دے چکی ہیں اگر ملازمت کرنا ہے تو اپنے محلّہ میں ایسے کارخانہ اور اسکول کھولئے جس میں صرف عورتیں ہی عورتیں ہوں اور وہ بھی سب پردہ میں ہوں۔

اگر ہم حکومت سے مطالبہ کریں تو مجبور ہو کر حکومت ایسے اسکول، کالج، اسپتال، کارخانہ وغیرہ قائم کر سکتی ہے جہاں مردوں کا سایہ بھی نہ پہنچتا ہو مگر ہم مطالبہ تو کریں اور اپنے کو رواج کے حوالے نہ کریں۔ ترقی پسندی کے بھوت سے نجات پائیں۔ باعفت عورتوں سے اور ان کے شریف و غیرت دار مردوں سے استدعا ہے کہ سب کرو مگر عورتوں کو ملازمت سے بچاؤ۔

غلامی آزادی، آوارگی

سنا ہے کہ کبھی بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔اور چوہا مزے میں آ کر موت کو بھول جاتا ہے۔مگر بلی۔ بلی ہے۔ چوہا۔ چوہا ہے۔ بلی چوہے کو کھائے گی۔ بہر حال دیکھتے ہی جھپٹ پڑے یعنی دشمنی میں مکاری کی آمیزش نہ کرے۔اسی طرح کے ذریعہ نعروں کے ذریعہ، تراشے خراشے جملوں کے ذریعہ عوام سے کھیلتے ہیں۔ان کے خیالات پر انداز ہوتے ہیں۔ان کے یقینوں کو شکوک میں تبدیل کر دیتے ہیں ان کے عقیدوں کو فاسد کر دیتے ہیں۔غرضکہ ذہنی سکون کو دماغی الجھنوں میں تبدیل کر دیتے ہیں یعنی علم وفلسفہ اور تحقیق وفکر کے نام پر بلی چوہے کا کھیل جاری ہے۔ یہاں چوہے ماننے والے۔ پرستار، عقیدت مند، حامی، فالورس کہلاتے ہیں۔مگر فکر وسخن کے نام پر شکار کھیلنے والوں کو بلی کہنا ممکن نہیں ہے۔عوام کو فریب دینا جرم ہے مگر شراب بنانے کی طرح یعنی جن کو حکومت نے لائسنس دے دیا ہے ان کو شراب بنانے، بیچنے، پینے، پلانے سب باتوں کا حق ہے ان کا کوئی کام جرم نہیں ہے البتہ جن کے پاس لائسنس نہیں ہے وہ مجرم ہیں۔

نیتا، لیڈر چاہے اقتدار میں ہو یا حزب مخالف میں ہو ان کے پاس عوام کو دھوکہ دینے کا لائسنس موجود ہے وہ ہر جھوٹ بول سکتے ہیں ہر مکاری کر سکتے ہیں۔ ہر فریب دہی کر سکتے ہیں کیونکہ یہ ان کا نیتائی حق ہے اور نیتا ہونا ان کا پیدائشی حق ہے۔ان کے علاوہ ہر جعلساز قابل مذمت ہے۔عوام کو دھوکہ دینے کا لائسنس اب ہر صاحب فکر وسخن کو

بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اچھا شعر کہنا۔ اچھا مضمون لکھنا۔ اچھی باتیں کر لینا سماج میں نہایت درجہ باعزت جگہ حاصل کر لینے کے لیے کافی ہے۔اس کے بعد حد درجہ گھناؤنی بدکار و بدکردار زندگی بر کرنے کے بعد بھی جو سماجی عزت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ دانشور ہونے کے بعد جو چاہیں کہیں جو چاہیں کریں ہر طرح کی چھوٹ حاصل ہے۔اور عقیدت مند مکھیوں کی طرح غلاظتوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ جب عوام میں مقبولیت کمال کا معیار بن جائے تو بلی چوہے کے اس کھیل کو کون روک سکتا ہے اور چوہوں کو کون بچا سکتا ہے۔ البتہ اگر آدمی اپنے خانہ میں رہے یعنی چوہا بل میں رہے تب ہی وہ محفوظ رہ سکتا ہے۔

آزادی کے لفظ کے ذریعہ عوام کو صاحبان فکر وسخن نے جس قدر گمراہ کیا ہے اور ان کے متاع عقیدہ وعمل کو جس طرح نذر آتش کیا ہے۔شاید کسی دوسرے لفظ کے ساتھ ایسا غیر منصفانہ سلوک نہیں کیا جا سکا۔ ہر آوارگی کو آزادی کا لفظ دے دیا گیا اور ہر اخلاقی بات کو غلامی کا نام دے دیا گیا۔مگر بھیڑ میں بھی آدمی اپنے راستہ ہی پر چلتا ہے۔ بھیڑ کی وجہ سے راستہ نہیں بدل دیتا ہے اپنی منزل کی طرف جاتا ہے۔ اپنے گھر ہی پہنچتا ہے۔ بھیڑ کے ساتھ نہیں چل پڑتا ہے۔ بلکہ رک رک کر سہی بھیڑ کو چیر کر راستہ بناتا ہے۔ اپنے ساتھیوں کو پوری قوت کے ساتھ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ ہر سکنڈ پر ایک کی خبر گیری کرتا ہے کہ کوئی کھو نہ جائے کوئی چھوٹ نہ جائے۔کوئی کچل نہ جائے۔اور جب سب مل کر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں تو بھیڑ میں راستہ بہ آسانی بن جاتا ہے اور سب ایک ساتھ اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

آج دانشوروں، صاحبان فکر وسخن کی زبردست بھیڑ ہے۔اس بھیڑ سے اپنے کو اور اپنے کنبہ کو اپنی قوم کو نکال کر دینی زندگی کے راستہ پر چلنا۔اور چلانا، قلب ودماغ کو

سکون تک پہنچانا تا کہ ابدی راحت یعنی جنت تک ہم سب پہنچ سکیں ہم سب کا انفرادی اور اجتماعی فرض ہے جو باہمی تعاون کے ساتھ سعی مسلسل کے بعد حاصل ہوسکتا ہے۔

حقوق اور فرائض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر شخص کا فریضہ ہے کہ اپنے فرائض پورے طور پر انجام دے اور دوسروں کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرے۔ ضرورت ہے ایسے نظام کی جو اداءِ فرائض میں کوتاہی نہ کرنے دے اور حق تلفی نہ دے۔ جب حقوق سلب کر لئے جائیں اور فرائض لاد دیئے جائیں تو اس کا نام غلامی ہے۔ جب فرائض یکسر بھلا دیئے جائیں اور حقوق کے نام پر لوٹ مچادی جائے تو اس کا نام آوارگی ہے جب حقوق ملیں فرائض ادا ہوں تو اس کا نام آزادی ہے لیکن آج حقوق کی ادائیگی کو غلامی کہا جاتا ہے۔ خالق، والدین، اقارب کے حقوق کی ادائیگی کے احکام مذہب کو غلامی کا نام دیا جاتا ہے۔ ادائیگی حقوق کی راہ میں ہونے والی تکلیف کو برداشت کرنے کی تلقین کو غلامی کی دعوت کہا جاتا ہے۔ شریعت، اخلاقیات عقلیات کی حدوں کو پھلانگ جانے کا نام آزدی قرار دیا جاتا ہے۔ اسلام غلامی کا مخالف ہے صرف غیر کی غلامی کا مخالف نہیں ہے بلکہ اپنی غلامی کا بھی مخالف ہے۔ نفس، ہوس، حرص، غصب، عادت سب کی غلامی سے روکتا ہے۔ سوسائٹی، سماج، فیشن، رواسم کی غلامی سے بھی منع کرتا ہے۔

غیر ذمہ دارانہ زندگی سے بھی روکتا ہے۔ خالق سے مخلوق تک جس سے بھی زندگی کی کوئی وابستگی پیدا ہوجائے چاہے وہ جانور کیوں نہ ہو اس کے حقوق کی رعایت کا حکم دیتا ہے۔ اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے والے کو مسلم قرار دیتا ہے۔ ذمہ داریاں معین کرنا صرف خدا کا حق قرار دیتا ہے اور خدا اپنی شان کے مطابق انعام دینے کا وعدہ کرتا ہے۔

لہٰذا دانشوروں کی آزادی سے بچئے۔ اور اسلام کی دی ہوئی آزادی کے مطابق زندگی بسر کیجئے۔ آزادی کے نام پر آوارگی سے معاشرہ کو بچائیے اور اسلامی قوانین کے مطابق ذمہ داری محسوس کرنے والا معاشرہ تعمیر کرنے میں لگ جائے۔ آزادی کے نام پر خواہشات کے غلام نہ بنئے بلکہ صرف احکام خدا کے سامنے جھکئے اور ہر غیر الٰہی حکم کی غلامی ہرگز قبول نہ کیجئے۔ ٹھوکر پر ٹھوکر کھانے والی دانشوری سے دور بھاگئے اور معصوم رہبری کی قیادت میں زندگی بسر کیجئے اور یاد رکھئے ہماری عقلیں ناقص ہیں اور مذہب کا بھیجنے والا خدا جن بے شمار مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے اس میں سے ایک حقیر مخلوق کا نام عقل ہے۔ لہٰذا حقیر کو عظیم کے مقابلہ پر نہ لائیے بلکہ حقیر کو عظیم کا خادم بنائے۔ عقل معبود مذہب نہیں ہے بلکہ خادم مذہب ہے۔ اور خالق معبود مذہب ہے۔

میز نہیں میدان

مریض، طبیب، تیمار دار، بیمار، بیمار کے اعزا اور مزاج پرسی کے لیے آنے جانے والے، بیمار کے لیے تحفہ لانے والے غرضکہ جب بیمار سے متعلق ہر شخص کی روش درست ہوتی ہے تو بیماری جلد دور ہوتی ہے۔طبیب کی زحمتیں کم ہوجاتی ہیں بیمار بھی مرض سے جلد نپٹ لیتا ہے لیکن اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی روش غلط ہوتی ہے تو فائدہ صرف بیماری کو ہوتا ہے اور باقی سب نقصان میں رہتے ہیں۔مریض ضدی ہو۔طبیب بے پرواہ ہو تیمار دار اپنے فرائض سے غافل ہو۔اعزا، ڈاکٹر اور حکیم سے بحث کرتے ہوں۔تو مریض کی شفایابی میں دیر لگے گی بلکہ مریض کے خاتمہ ہی پر مرض ختم ہوگا۔یہ بات سب کی سمجھ میں آجاتی ہے۔موٹی عقل والے بھی ان نکتوں کو بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ البتہ ایک باریک اور مہین غلطی ایسی ہوتی ہے جس کی طرف سب متوجہ نہیں ہوتے۔مگر اس غلطی سے مہلک نقصان ہوتے ہیں۔اس غلطی کی تفصیل یہ ہے کہ مریض سے ملنے جلنے والوں میں کچھ ''نیم حکیم'' ہوتے ہیں۔یہ پیشہ ور نیم حکیم نہیں ہوتے ہیں۔نہ ان کا مطب ہوتا ہے نہ یہ پریکٹس کرتے ہیں۔بلکہ یہ معالج کے بارے میں، داؤں کے بارے میں، غذاؤں کے بارے میں مفت مشورے دیتے ہیں۔یہ پیشہ ور نہیں بلکہ پیدائشی مشیر ہوتے ہیں۔یہ مریض کے پاس نہ اٹھنے کی نیت سے بیٹھیں گے۔اور اتنے معالجوں کے نام پیش کردیں گے کہ ان کی فہرست یاد کرنا مشکل ہوجاتے۔اتنی دواؤں کے استعمال

کے مشورے دیدیں گے کہ سننے والے، قوت فیصلہ وقوت حافظہ درکنار، قوت سماعت بھی کھو بیٹھیں گے۔غذاؤں پر اتنے متضاد تبصرے سنادیں گے کہ کھایا ہوا زہر معلوم ہونے لگے گا اور ان کی شوق دلانے والی تقریر کے نتیجے میں مریض زہریلی غذا کے لیے بیتاب ہوجائے گا۔یہ مشیر بڑی پابندی سے آئیں گے۔روزانہ اپنے ساتھ لٹریچر کی نئی فائل لائیں گے۔مریض کو ''دورائے'' کے دوراہے پر کھڑا کردیں گے، گھر میں معالج، دوا، غذا کے بارے میں پارٹیاں پیدا کردیں گے۔کچھ ان کو دیکھ کر اپنا اور ان کا سر پھوڑنے پر تیار نظر آئیں گے کچھ ان کے لیے اتنا بچھتے چلے جائیں گے کہ ڈاکٹر اور مریض کی خاطر مدارات کے بجائے صرف مشیر صاحب کی خاطر مدارات ہوگی۔غرضکہ علاج ملتوی رہے گا۔دوائیں مشکوک قرار پاجائیں گی لہٰذا رکھی رہیں گی۔پکا کھانا مضر قرار پاجائے گا اور مفید کھانے کی تیاری میں اتنی دیر لگے گی کہ مریض اپنے اور گھر والوں کو کھانے پر تیار ہوجائے گا۔مریض تڑپتا رہے گا مگر علاج بند رہے گا اور بحثیں جاری رہیں گی۔لہٰذا ضرورت ہے کہ مریض کو اور اس کے گھر والوں کو ان خدائی خوار مشیروں سے بچایا جائے ورنہ مریض کا خدا حافظ۔

یہ تمہید اس گذارش کے لیے تھی کہ یقینی طور پر ہماری قوم، ہمارا سماج، ہماری تہذیب بیمار ہے۔اس کو غربت، جہالت، بے دینی اور فضول رسموں کی پابندی کی بیماری ہے کسی کو صرف ایک بیماری ہے کسی کو دو بیماریاں ہیں کوئی تمام بیماریوں میں مبتلا ہے۔ عوام، خواص، عورت، مرد، تعلیم یافتہ اور ناخواندہ، کم سن اور بوڑھے، علماء، مقرر، شاعر، دانشور سب کچھ نہ کچھ بیمار ہیں۔بعض کو بیماری کا احساس نہیں ہے بلکہ وہ ورم کو فربہی سمجھ رہے ہیں۔کچھ بیماری کو معمولی سمجھ رہے ہیں حالانکہ بیماری کینسر سے کم نہیں ہے۔کچھ کو

بیمار ہونے کے بجائے معالج ہونے کی غلط فہمی ہوگئی ہے لہٰذا وہ نہ صرف اپنی بیماری میں اضافہ کررہے ہیں بلکہ پوری قوم کے لیے دردسر بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے اکثر ادارے، انجمنیں، کونسلیں، کانفرنسیں، فیڈریشن، قومی دردسر ہونے کے علاوہ کچھ نہیں۔ جلسے شاندار، تقریریں دھواں دھار، کمیٹیاں بے شمار، اختلافات کی بہار، ہر گلے میں ہار، ریزولیوشن انقلاب، لیکن عمل مفقود۔ فنڈ زیرو، رضا کار معدوم، کارروائی ہوائی، تجاویز ردی کی ٹوکری میں اور بیماریاں اپنی جگہ پر۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ قوم کو ان مشیروں سے بچایا جائے۔ ہر انفرادی اور اجتماعی بیماری کا واحد علاج ہے۔ ''پابندی شریعت'' شریعت صرف چند پابندیاں عائد نہیں کرتی ہے۔ بلکہ فرد کو اپنے لئے اور خاندان وقوم کے لیے باعمل رہنے کو واجب قرار دیتی ہے۔

نگاہ شریعت میں اگر حرام کمانا گناہ ہے تو عیال کے لیے روزی کمانا واجب ہے۔ ظالم کی مدد کرنا حرام ہے تو مظلوم کی حفاظت کے لیے جسم کو قوی بنانا، قوم کو خوش حال بنانا۔ افراد کو علم وہنر سے بہرہ مند بنانا۔ ملک کو سائنسی، صنعتی، زراعتی، تجارتی طور پر مضبوط بنانا واجب ہے۔

ہم جب کبھی اپنی کسی کمزوری کا تجزیہ کریں گے تو آخر میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ ہم نے کسی نہ کسی حکم خدا سے انحراف کیا ہے۔ کسی نہ کسی ارشاد نبیؐ وامامؑ کی ضرورت مخالفت کی ہوگی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تدبیر کی کامیابی کے لیے خدا معصومین علیہم السلام کی غیبی تائید بھی درکار ہے لہٰذا خرابیوں کو دور کرنے کے لیے بھی اور خوبیوں کو پیدا کرنے کیلیے بھی شریعت کی پابندی ضروری ہے۔ پابندی شریعت کے لیے شریعت سے واقفیت ضروری ہے احکام شریعت سے علمی عقیدت ضروری ہے۔ جب ہر

فرد حدود شریعت میں اپنے فرائض ادا کرے گا تو قوم میں ہر رخ پر نئی زندگی نظر آئے گی۔ مگر یہ مقصد میز کے گرد بیٹھ کر گفتگو کرنے سے حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے لیے ہر شخص کو میدان عمل میں اترنا ہوگا۔ گھر، مسجد، اسکول، دفتر، بازار، کھیت، کارکانہ غرضکہ جہاں بھی زندگی پلتی ہے یا چلتی پھرتی ہے۔ ایسی ہر جگہ ہم کو دینی رہبری اور روحانی قیادت میں دنیاوی جدوجہد کرنا ہوگا۔ آیئے ہم آپ بہت دن سوچ سکے اب کچھ کرگذرنے کی نیت سے اٹھ کھڑے ہوں۔ کامیابی دینے والا خدا ہے۔ مدد کرنے والے نبیؐ وامامؑ ہیں۔ خالص جذبہ اور کڑی محنت ہمارا اور آپ کا فریضہ ہے۔